ذوالقعدہ ۱۴۴۲ھ

جولائی ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

قانون تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ

تاریخی پس منظر اور مخالفت کے اسباب

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

مضامینِ تدریس

عرصہ 39 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرامر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی ﷺ
- مطالعہ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سالِ دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ آغاز رجسٹریشن 1 اگست ☆ انٹرویو 23 اگست

آغاز 24 اگست 2021 (اِن شاءاللہ)

ایامِ تدریس: پیر تا جمعہ

اوقاتِ تدریس: صبح 8 بجے تا 12:30

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے اپنی رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز ——— قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

email:irts@tanzeem. org

www.tanzeem.org

زیرِ انتظام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org

03161466611 - 04235869501-3

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 70

شمارہ : 7

ذوالقعدہ 1442ھ

جولائی 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید [illegible]

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر [illegible]

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارُالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

اسلاموفوبیا سے اسلاموفوبک دہشت گردی تک — ایوب بیگ مرزا

تذکرہ وتبصرہ — 9

قانون تحفظِ ناموسِ رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بیان القرآن — 21

سورۃ الرحمٰن (مکمل) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دعوتِ فکر — 46

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ — محمد رشید عمر

تذکّر و تدبّر — 51

شہد کی مکھی: اللہ کی قدرت کی عظیم نشانی — ڈاکٹر محمد سرشار خان

انوارِ ہدایت — 69

حُبّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

افکار و آراء — 73

مطالعۂ تاریخ — انجینئر مختار فاروقی

تاریخِ اُمَم — 75

بیت المقدس اور ہیکلِ سلیمانی — رضی الدین سیّد

علومِ قرآنی — 82

علمِ تفسیر اور مفسرینِ کرام — پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلاموفوبیا سے اسلاموفوبک دہشت گردی تک

اسلاموفوبیا میں مبتلا مغرب اب اسلاموفوبک دہشت گردی پر اتر آیا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں اب ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جن میں معصوم مسلمان شہریوں کو گاڑیوں تلے کچلا جا رہا ہے۔ انفرادی زندگی میں آزادی کا قائل مغرب مسلمان خواتین کے چہرے سے نقاب نوچ رہا ہے۔ جمہوریت کو اپنا ایمان قرار دینے والے دوسروں پر آمریت مسلّط کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کا یہ دعویٰ کہ وہ سائنس‘ ٹیکنالوجی اور تہذیب کی ترقی میں عروج پر پہنچ چکا ہے‘ آدھا سچ ہے‘ کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اُن کی ترقی ظاہر و باہر ہے‘ البتہ جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اُن کا دعویٰ نہ صرف غلط ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ تہذیبی حوالے سے ترقی معکوس دکھائی دیتی ہے۔ مغرب کی تہذیب کا جس زاویہ سے بھی جائزہ لیں وہ بدترین زوال کا شکار ہے۔ معاشرتی سطح پر فحاشی‘ عریانی اور بے حیائی نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ معاشی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام نے‘ جو بدترین استحصالی نظام ہے‘ انسانوں کو بُری طرح تقسیم کر کے haves اور have nots کی ایک مستقل تفریق پیدا کر دی ہے۔ پھر یہ کہ اِس معاشی نظام نے سود کی لعنت انسانوں کی گردنوں میں مستقل طور پر طوق کی طرح ڈال دی ہے۔ سیاسی سطح پر غیر اقوام کے ساتھ بڑی چالاکی و مکاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور اس حوالے سے اہلِ مغرب کے دل و دماغ پر مذہبی اور نسلی تعصّب غالب ہے۔ قومی اور باہمی معاملات میں جھوٹ‘ فریب اور دھوکے سے گریز کرنے والا مغرب بین الاقوامی معاملات میں جھوٹ‘ فریب‘ دغا اور عہد و پیمان سے منحرف ہونا اپنا حق سمجھتا ہے۔

ہٹلر کا وزیر اطلاعات گوئبلز بدنام تھا کہ وہ ایسا مسلسل اور زوردار جھوٹ بولنے کا قائل تھا جو حق اور سچ کو دبا دے۔ آج کا مغرب اِس حوالے سے بھی کئی ہاتھ آگے ہے۔ وہ ایک غلط کام خود کرتا ہے اور اُسے دوسروں پر تھوپ دیتا ہے۔ نائن الیون کے بعد ہونے والے دہشت گردی کے

واقعات اور مغرب کے طرزِ عمل پر اگر غور و فکر کیا جائے تو ایک قاری کو یہ نکتہ بڑی آسانی سے سمجھ آ جائے گا۔ اب یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ نائن الیون ایک inside job تھا۔ اِس پر تو بہت سی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں عالمی سطح پر انجینئرز کی ایک بہت بڑی تعداد کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں کہ جہازوں کے ٹکرانے سے ٹوئن ٹاورز اِس انداز سے گر سکتے تھے جیسے وہ گرتے دیکھے گئے۔ بہرحال اِس حادثے کو مسلمانوں کے سر تھوپ کر کئی مسلمان ممالک تباہ و برباد کر دیے گئے۔ پھر یہ کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے صدارتی دور میں کھلم کھلا یہ الزام لگایا تھا کہ ’’داعش‘‘ سابقہ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن اور افغانستان میں امریکی نمائندے اور FPAK اصطلاح کے موجد رچرڈ ہالبروک نے قائم کی تھی۔ کسی امریکی نے اس کی تردید نہیں کی۔ پھر ’’داعش‘‘ کو دنیا میں ہوّا بنا کر پیش کیا اور دہشت گردی کے واقعات میں اُس کی پشت پناہی کی اور مسلمانوں ہی کے خون سے ہولی کھیلی۔ اور یہ سب کچھ خود کرنے کے بعد اسلام کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا۔

مغرب کی اِن گھٹیا حرکتوں سے یقیناً مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور وہ اسلام کو بھی بدنام کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔ البتہ اِس حوالے سے مسلمانوں کو مکمل طور پر بریٔ الذِّمہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اُنھوں نے بہت بڑی حماقتوں کا مظاہرہ کیا‘ وہ مغرب کی پالیسی نہ سمجھ سکے۔ وہ اشتعال میں آ کر مغرب کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں جس سے مغرب کو اپنا ایجنڈا آگے بڑھانے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ قصّہ کوتاہ مغرب اپنا جھوٹا اور سازشوں پر مبنی بیانیہ آگے بڑھانے میں بہت کامیاب رہا‘ لیکن —— اور یہ بہت بڑا لیکن ہے‘ اس لیے کہ آج کی دنیا نے بھی اپنی آنکھوں سے ایک معجزہ دیکھا۔ وہ یہ کہ مغرب کی انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کو دنیا کی پسماندہ ترین اور نہتی افغان قوم کے ہاتھوں ذِلّت آمیز اور عبرتناک شکست ہوئی ہے۔ اِس شکست نے مغرب کو بدحواس کر دیا ہے۔ ہم آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیس سالہ جنگ میں چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے افغان طالبان سے سر ٹکرانے‘ کھربوں ڈالر اور ہزاروں امریکیوں کی جانیں اِس میں جھونکنے کے بعد جب شکست مغرب کا مقدّر بنی تو وہ بحیثیت مجموعی نفسیاتی مریض بن گیا۔ اسلام کا خوف اُس کے رگ و پے میں اُتر گیا اور وہ بُری طرح اسلاموفوبیا میں مبتلا ہو گیا۔ لہٰذا مغرب کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں یورپ کا شاید ہی کوئی ملک ہو جس

میں مسلمانوں کے خلاف تخریب کاری یا دہشت گردی نہ ہوئی ہو۔ امریکہ‘ انگلینڈ‘ فرانس‘ جرمنی‘ ڈنمارک اور نیوزی لینڈ میں کہیں حجاب پہننے والی خواتین پر حملے ہو رہے ہیں‘ کہیں مساجد میں نمازیوں پر حملے ہو رہے ہیں‘ عدالتوں میں ججوں کے سامنے مسلمانوں پر قاتلانہ حملے کیے گئے ہیں۔ پھر یہ کہ سوئٹزرلینڈ جیسا ملک جو نہ سیاسی حیثیت رکھتا ہے اور نہ عسکری‘ وہاں مساجد کے میناروں پر اعتراض اُٹھایا جا رہا ہے۔ ہماری رائے میں مغرب کی یہ ڈسپریشن (desperation) شکست سے پیدا شدہ فرسٹریشن کا نتیجہ ہے۔

افغانستان کے علاوہ ایک اور ملک جو امریکہ اور مغرب کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے‘ وہ ایٹمی پاکستان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی دنیا تمام اسلامی ممالک کی حربی قوت کو تہس نہس کر چکی ہے۔ پاکستان کی عسکری قوت کو بھی اُنھوں نے اپنے زرخرید دہشت گردوں کے ذریعے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ بھی نوے فیصد جیت چکا ہے۔ ایٹمی صلاحیت کا حامل ہونے کی وجہ سے مغرب اور اِس کے حواریوں کے لیے پاکستان کے ساتھ کھلی جنگ کرنا آسان نہیں ہے‘ کیونکہ مغرب کا ناجائز بچہ اسرائیل اور اس کا انتہائی لاڈلا دوست بھارت دونوں پاکستان کے ایٹمی میزائلوں کی زد میں ہیں۔ درحقیقت ہم قارئین پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی مکمل کامیابی میں ان دو رکاوٹوں نے مغرب اور اتحادیوں میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی ہے۔ سانحہ نیوزی لینڈ‘ فرانس اور کینیڈا وغیرہ اِس جھنجھلاہٹ کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہمارا یہ تجزیہ درست ہے تو اُمّتِ مُسلمہ کے لیے سمجھنے کا اصل مسئلہ اور کرنے کا اصل کام کیا ہے!

ہمارا پختہ ایمان ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی ایسا مرحلہ اور موڑ نہیں ہوتا جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوق کی رہنمائی نہ فرمائے۔ ایک طرف اللہ ربّ العزت سورۃ الانفال میں فرماتا ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰﴾ ”اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے‘ تمہاری ہیبت بیٹھی رہے گی۔ اور تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ

کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا ذرا بھی نقصان نہ کیا جائے گا“۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسباب پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے اور دوسری طرف کلام پاک میں جگہ جگہ ثابت کرتا ہے کہ وہ (یعنی اللہ) مسبّب الاسباب ہے اور وہ خود کسی سبب کا محتاج نہیں۔ گویا ایک مسلمان کے لیے جاننے اور ایمان لانے کی بات یہ ہے کہ وہ سبب کا بندوبست تو کرے لیکن اسباب پر ہرگز ہرگز انحصار نہ کرے۔ اپنی کامیابی اور ناکامی کی وجہ سبب نہ سمجھے بلکہ مسبّب الاسباب کا حکم اور فیصلہ سمجھے۔ اس آئینہ میں افغانستان اور پاکستان کا عکس دیکھیں۔ افغان طالبان نے مسبّب الاسباب پر بھروسہ کیا تو غریب‘ پسماندہ اور نہتے ہونے کے باوجود مغرب کی آسمان کو چھوتی ہوئی ٹیکنالوجی کو مفلوج کر دیا اور اُسے شکست فاش دی۔ آج تمام بڑی قوتیں اُن سے خوفزدہ ہیں۔ لیکن دشمن کو شکست دینے کے باوجود اپنی فتح کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں کچھ اسباب بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے‘ تاکہ کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی اُدھر کا رُخ ہی نہ کرے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے‘ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا جرم دو طرح کا ہے۔ ایک تو بدقسمتی سے یہاں کی مقتدر قوتوں نے صرف اسباب کا سہارا لیا جس کا یہ نتیجہ تو نکلا کہ فی الوقت ہم اپنا وجود بچا لینے میں کامیاب رہے‘ لیکن چونکہ مسبّب الاسباب سے عملی طور پر فاصلہ رکھا لہٰذا اسباب موجود ہونے کے باوجود ہم پر دشمن کا زبردست خوف طاری ہے‘ ہماری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور دنیا ہمیں ایک مقروض اور مفلوج ملک کے طور پر دیکھتی ہے۔ دوسرا جرم نظریۂ پاکستان کی عملی تعبیر کے حوالے سے ہے۔ یعنی تحریک پاکستان کے دوران لگائے جانے والے نعرے ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الّا اللہ!“ کو فراموش کر دینا اور پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی بجائے عملاً ایک سیکولر ریاست بنا دینا۔ یہ انحراف‘ یہ عہد شکنی ہمیں بہت مہنگی پڑی ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ دونوں کوتاہیاں یا دونوں جرم الگ الگ نہیں بلکہ اِن کی بنیاد ایک ہی ہے۔ اگر ہم پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو مسبّب الاسباب یعنی اللہ ربّ العزّت پر مکمل بھروسہ اور انحصار اِس کا فطری نتیجہ ہوتا۔ گویا مسلمانانِ پاکستان کا اصل جرم تو ایک ہی ہے یعنی یہاں دین قائم نہ کرنا‘ لیکن یہ ہے اتنا سنگین کہ کوئی دنیوی سطح پر دی ہوئی مثال اِس پر منطبق نہیں ہو سکے گی۔

(باقی صفحہ 45 پر)

قانون تحفّظِ ناموسِ رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

تاریخی پس منظر اور مخالفت کے اسباب

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فکر انگیز خطاب

بانی تنظیم اسلامی نے یہ خطاب ۱۰ جولائی ۱۹۹۸ء کو مسجد دارالسلام باغِ جناح میں اجتماعِ جمعہ سے فرمایا تھا' جس کی تلخیص 'میثاق' کے شمارہ اگست ۱۹۹۸ء میں شائع کی گئی تھی۔ موجودہ حالات کے تناظر یہ فکر انگیز خطاب نظر ثانی کے بعد ایک بار پھر ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

میری آج کی گفتگو کا موضوع ''قانون تحفّظِ ناموسِ رسالت'' ہے' جسے عرفِ عام میں ''قانون توہینِ رسالت'' کہا جاتا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ گزشتہ دنوں مجھے ایک صاحب کی طرف سے رقعہ ملا تھا جس میں توہینِ رسالت کے حوالے سے سوال کیا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر فوری طور پر ۱۹۹۱ء میں بننے والا توہینِ رسالت کا قانون میرے ذہن میں آیا' جس کے بارے میں نہ صرف اندرونِ ملک ایک اقلیتی طبقے نے شدید احتجاج کیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی غیر مسلم حکومتوں کی جانب سے تاحال احتجاج جاری ہے۔ مگر بعد ازاں جب مَیں نے اس رقعے کو غور سے پڑھا تو اس میں زیر بحث موضوع سے ہٹ کر سوال کیا گیا تھا۔ رقعہ کی عبارت یہ ہے:

''محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' امیر تنظیم اسلامی' السلام علیکم:

توہینِ رسالت کیا ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کی نفی توہین رسالت کے ضمن میں نہیں آتی؟ اگر آتی ہے تو کیا حکومتِ وقت سودی نظام جاری رکھ کر توہین

رسالت کا ارتکاب نہیں کر رہی؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے آخری خطبۂ حجۃ الوداع میں سود کو حرام قرار دیا ہے' اگر ہم اس نظام کے خلاف جِدّ و جُہد نہ کریں تو کیا ہم بھی توہینِ رسالت کا جرم کرنے والوں میں شامل نہ ہوں گے؟ آپ اپنا موقف واضح طور پر سمجھا دیں۔''

توہینِ رسالت کے قانون کے حوالے سے یہ مسئلہ کافی عرصہ سے زیر بحث رہا ہے مگر مَیں نے اس مسئلہ پر کبھی گفتگو نہیں کی' تاہم اب مَیں اس کمی کی تلافی کرتے ہوئے اس موضوع پر اپنے نقطۂ نظر کو مرتّب انداز میں واضح کر رہا ہوں۔ اس رقعہ میں اٹھائے گئے استفسار کے پس منظر میں جو چیز مضمر ہے اسے سمجھنا ضروری ہے۔ ایک کفر حقیقی ہے اور دوسرا کفر قانونی' جس کے ارتکاب سے کوئی شخص مرتد قرار پاتا ہے۔ کفر حقیقی کیا ہے؟ ایک حدیث کی رو سے ((مَنْ تَرَکَ الصَّلَاۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ جِھَارًا)) (رواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط) ''جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے اعلانیہ کفر کیا''۔ لیکن اس فرمانِ نبویؐ کا یہ مطلب نہیں کہ تارکِ نماز قانونی طور پر کافر ہو گیا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَہٗ)) (متفق علیہ) ''جس شخص نے قرآن کی حرام کردہ کسی شے کو اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا اُس کا قرآن مجید پر کوئی ایمان نہیں''۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایسا شخص مرتد ہو گیا ہے؟ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین مرتبہ قسم کھا کر ارشاد فرمایا: ((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ' وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ' وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں رکھتا''۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: کون اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((الَّذِیْ لَا یَأْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ)) (متفق علیہ) ''جس کا پڑوسی اُس کی ایذا رسانی سے چین میں نہیں ہے''۔ پڑوسی کے ساتھ بُرا سلوک نہ شرک ہے' نہ کفر اور نہ ہی کبیرہ گناہ ہے' بلکہ یہ ایک اخلاقی بُرائی ہے' کج خلقی ہے' لیکن ایسے رویے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عدم ایمان کی تین دفعہ قسم کھائی تو کیا ایسا شخص کافر ہے؟

یہ بڑا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ تھا جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الفِقْہُ الْاَکْبَر'' میں بڑی عمدگی سے حل کیا ہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب

کافر نہیں ہوتا' البتہ دین کی کسی بنیادی چیز کے انکار سے کفر لازم آتا ہے۔ جیسے نماز کا انکار کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے مگر تارکِ صلوٰۃ کافر نہیں ہوتا۔ کفر حقیقی کا محض مرتکب قانوناً مرتد نہیں ہوتا' البتہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے صوفیاء کے حلقے میں ایک قول مشہور ہے جس سے اس معاملے کے انتہائی پہلو کی عکاسی ہوتی ہے کہ ''جو دم غافل سو دم کافر''۔ گویا کفر حقیقی کی آخری حد یہ ہے کہ انسان کا جو سانس بھی غفلت میں گزرتا ہے وہ گویا ایک طرح کے کفر میں گزرتا ہے۔ اسی طرح ایک شرک فی العقیدہ کا معاملہ ہے اور ایک شرک فی العمل ہے۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا ہی معاملہ نفاق کا بھی ہے۔ ایک نفاقِ قلبی ہے اور دوسرا نفاقِ عملی یا فعلی ہے۔ یعنی ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس میں ایک طرح کا نفاق موجود تو ہے لیکن اسے آپ عقیدے کا نفاق ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

ناموسِ رسالت کی توہین کے ضمن میں ایک توہینِ رسالت ظاہری یا قانونی ہے اور ایک حقیقی یا عملی' اگرچہ اس میں نیت شامل نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضور ﷺ کی سب سے بڑی توہین یہ ہے کہ آپؐ کے احکامات سے سرتابی کی جائے۔ آپؐ کی نافرمانی بھی توہین رسالت ہی کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان کو پس پشت ڈال کر مَن مانی کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ پر ایمان کے منافی ہے' لیکن اس کے باوجود قانونی اعتبار سے فرق و امتیاز اپنی جگہ موجود رہے گا۔ ایک معاملہ ایسے جرم کا ہے جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے جبکہ بعض اخلاقی جرائم ہوتے تو بہت بڑے ہیں مگر یہ قانون کی زد میں نہیں آتے' جیسے غیبت کا گناہ ہے۔ اخلاقی سطح پر جرم اور قانونی سطح پر جرم کے مابین فرق تو رہے گا۔ چنانچہ توہینِ رسالت کا قانونی اطلاق صرف کسی ایسے قول' فعل یا ظاہر و باہر عمل پر ہوگا جس سے حضور ﷺ کی توہین کا پہلو نکلتا ہو اور اس امر کے شواہد بھی موجود ہوں کہ ایسا بدنیتی سے کیا گیا ہے۔ غیر شعوری طور پر توہینِ رسالت کا ارتکاب قابلِ معافی ہے جو توبہ کرنے سے معاف ہو جائے گا۔ البتہ اگر شواہد سے یہ ثابت ہو جائے کہ کسی شخص کی طرف سے جان بوجھ کر اور شعوری طور پر تحریر و تقریر یا فعل کے ذریعے توہینِ رسالت کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ایسے شخص پر توہینِ رسالت کے قانون کا اطلاق یقیناً ہوگا۔

جہاں تک حقیقی توہینِ رسالت کا تعلق ہے' پوری اُمّتِ مُسلمہ اسلامی نظام نافذ نہ کر کے توہینِ رسالت کے جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ دنیا کا کون سا اسلامی ملک ایسا ہے جس میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ قائم ہے؟ اگرچہ سعودی عرب' ایران اور افغانستان میں چند اسلامی قوانین نافذ ہیں مگر اسلام کا نظامِ حیات مکمل طور پر تو کسی ایک ملک میں بھی نافذ نہیں ہے۔ پوری دنیا کے کسی ایک ملک میں بھی اسلامی نظام کا نافذ نہ ہونا گویا حضور ﷺ کی توہین کے مترادف ہے۔ مزید برآں' اُمّت کی عظیم اکثریت انفرادی سطح پر بھی اس جرم کی مرتکب ہو رہی ہے۔ البتہ کچھ لوگ ضرور ایسے موجود ہیں جنہوں نے دین کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے اور حضور ﷺ کی سنتوں پر عمل پیرا ہیں۔ ذرا غور فرمایئے وہ مسلمان جو ''شیو'' بناتا ہے وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ایک واضح حکم کی حکم عدولی و نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ وہ روزانہ اپنے عمل سے حضور ﷺ کے حکم کی توہین کر رہا ہے۔ اُس نے محض زمانے کے ایک فیشن اور چلن کی وجہ سے حضور ﷺ کے حکم اور عمل دونوں کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ داڑھی رکھنا تو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی سُنّت ہے' خود حضور ﷺ کا قول و عمل اس پر شاہد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَأَرْخُوا اللِّحَى)) (صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ) ''مونچھیں کترواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ''۔ داڑھی رکھنا سُنّت مؤکدہ ہے جس کو ترک کرنا یقیناً آپ ﷺ کے حکم کی توہین ہے۔ چونکہ یہ توہین عموماً شعور اور ارادہ کے ساتھ نہیں ہوتی لہٰذا اسے عمل کی کوتاہی کا نام ہی دیا جا سکتا ہے!

قانون توہینِ رسالت کا تاریخی پس منظر

پاکستان میں توہین رسالت کے مرتکب لوگوں کو سزا دینے کے لیے قانون سازی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ''قانون تحفظِ ناموسِ رسالت'' کی منظوری کا باقاعدہ مطالبہ ۱۹۸۳ء میں ہوا۔ لاہور میں مشتاق راج نامی وکیل نے انگریزی زبان میں Heavenly Communism نامی کتاب لکھی جس میں اُس نے اللہ تعالیٰ' حضور ﷺ اور اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا۔ اس کتاب پر پورے ملک میں زبردست احتجاج کیا گیا تو مجبوراً حکومت نے نقص امن کے خطرے کی وجہ سے اس وکیل کو دفعہ 295(A) کے تحت

گرفتار کرلیا۔ ۱۹۸۴ء میں وفاقی شرعی عدالت میں جناب اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ کی طرف سے شریعت پٹیشن دائر کی گئی جس میں کہا گیا کہ توہینِ رسالت کو قابلِ گرفت جرم قرار دیا جائے اور اس کی سزا موت مقرر کی جائے۔ یوں اس اہم مسئلے پر پورے ملک میں بحث و تمحیص شروع ہوگئی۔ اسی دوران انسانی حقوق کی علَم بردار ہونے کے حوالے سے شہرت حاصل کرنے والی خاتون ایڈووکیٹ مسماۃ عاصمہ جیلانی نے اپنی تقریر میں حضور ﷺ کے لیے نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ اس خاتون نے ''اُمّی'' کے لیے ''illiterate'' کا لفظ استعمال کیا' جو یقیناً توہین آمیز ہے۔ ایک خاتون ایم این اے آپا نثار فاطمہ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی خواہر نسبتی) جو دین کی پُرجوش مبلغہ بھی تھیں' انہوں نے ۱۹۸۷ء میں قومی اسمبلی میں (295(C کے نام سے ایک ''بِل'' پیش کیا۔ اس بل کو قومی اسمبلی نے باقاعدہ بحث کے بعد منظور کرلیا۔ اس قانون کے مطابق توہین رسالت کے جرم کے مرتکب شخص کے لیے عمر قید اور سزائے موت پر مبنی دو سزائیں مقرر کر دی گئیں۔ اس پر جناب اسماعیل قریشی نے شرعی عدالت میں ایک اور پٹیشن دائر کر دی کہ توہین رسالت کے جرم پر عمر قید کی سزا درست نہیں ہے' اس قانون میں ترمیم کر کے سزا بطورِ حد صرف ''موت'' مقرر کی جائے۔ لہٰذا ۱۹۹۱ء میں (295(C کی حیثیت سے پورے ملک میں ''تحفّظِ ناموسِ رسالت ﷺ'' کا قانون لاگو ہوگیا' جس کے خلاف بین الاقوامی سطح پر احتجاج کیا جارہا ہے۔ امریکی صدر کلنٹن اور پوپ پال تک کو اس قانون سے پریشانی لاحق ہے۔ تحفّظِ ناموسِ رسالت ﷺ کے قانون کی منظوری جناب اسماعیل قریشی کا ایک کارِنمایاں ہے۔

اسی طرح کا معاملہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اٹھنے والی ختمِ نبوّت کی تحریک کے نتیجے میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے قادیانی مسئلے کو قومی اسمبلی کے ذریعے نہایت عمدہ طریقے سے حل کر دیا۔ اگرچہ اس سے قبل مختلف عدالتی کیسوں میں قادیانیوں کے خلاف کفر کے فیصلے ہو چکے تھے مگر اس معاملہ کو قانونی حیثیت قومی اسمبلی کے فیصلے کے ذریعے حاصل ہوئی۔ اسی طرح تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کا قانون وفاقی شرعی عدالت کی ہدایت پر قومی اسمبلی کے ذریعے نافذ العمل ہوا ہے۔

قانون تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کی اصل حکمت

قانون تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کی حکمت اور غیر مسلموں کی طرف سے اس کی مخالفت کو واضح کرنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کا ایک قانون ''قتلِ مرتد'' کا ہے جو موجودہ دنیا کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ دنیا میں مقبولِ عام تصوّرات میں سے ایک تصوّر شخصی آزادی کا ہے' یعنی ایک انسان جو چاہے عقیدہ رکھے اور جب چاہے اپنے مذہب کو بدل لے' جبکہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے لیے اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنے کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح ایک معاملہ اظہارِ رائے کی آزادی کا بھی ہے' یعنی ایک شخص اپنے مطالعہ اور غور و فکر سے جو بھی رائے پیش کرنا چاہے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیے۔ وہ اگر سلمان رشدی کی طرح پیغمبر ﷺ کی زندگی پر کیچڑ اچھالنا چاہے تو اسے اس کا بھی حق حاصل ہے۔ آج کی دنیا میں رائج ان نظریات کا اصل سبب کیا ہے' اسے جاننا بہت ضروری ہے۔

دنیا میں یہ مقبولِ عام تصوّرات یہودیوں کی طویل جدّوجُہد کا نتیجہ ہیں۔ سیکولرازم کا نظریہ یہ ہے کہ ریاست کے قوانین کا کوئی تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہوگا۔ دنیا کی ہر ریاست کا ایک سرکاری مذہب تو ہوتا ہے۔ مثلاً امریکہ کا سرکاری مذہب عیسائیت ہے اور وہاں سرکاری تعطیلات عیسائی مذہب کے حوالے سے ہی ہوتی ہیں' لیکن قانون سازی کی سطح پر انجیل یا تورات کے کسی حکم سے ریاست امریکہ کو کوئی بحث اور سروکار نہیں ہے۔ سیکولرازم کے نظریات پر مبنی یہ نظام گزشتہ دو سو برس سے دنیا میں رائج ہے۔ یہ خود بخود نافذ نہیں ہوا' بلکہ خدا' رام اور God کو عبادت گاہوں تک محدود کر کے' اسے ایوانِ حکومت اور ایوانِ عدالت سے دیس نکالا دے کر ''No Admission'' کا بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ ملکی قوانین کو اسمبلی کے ممبران کی اکثریت سے منظور کرالیا جاتا ہے اور عدلیہ بھی کسی آسمانی وحی کی قطعاً پابند نہیں ہوتی۔ گویا سیکولرازم کے تحت انسانی زندگی میں مذہب کا کردار انسان کی ذات تک محدود کر دیا گیا ہے' جبکہ انسان کی اجتماعی زندگی رائج الوقت سیکولر نظام کے تحت چل رہی ہے۔ سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام کے ساتھ دیوانی اور فوجداری قوانین بھی سیکولرازم

کے تابع ہیں۔ گویا دنیا کا ۹۹ فیصد نظام لادینیت پر چل رہا ہے۔ اس صورت حال میں اگر مذہب کے چھوٹے سے دائرے اور گوشے میں تبدیلی بھی واقع ہو جائے تو آخر کون سا بڑا فرق واقع ہو جائے گا؟ کوئی شخص پہلے ہندو یا عیسائی تھا اور اب مسلمان ہو گیا تو اس سے ملک کے نظام میں تو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا سیکولرازم کے تحت مذہب تبدیل کرنے کی آزادی بھی دی جاتی ہے اور بانیانِ مذاہب کی ذات پر ہر قسم کی ہرزہ سرائی کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''Son of God'' جبکہ یہودی انہیں ''Son of man'' قرار دیتے ہیں۔ گویا ہر ایک کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہے۔

یہ سب کچھ یہودی سازش کی کرشمہ سازی ہے۔ یہودی بہت چھوٹی سی قوم ہے۔ پوری دنیا میں یہود کی تعداد ۱۳ تا ۱۴ ملین سے کسی طرح بھی زائد نہیں ہے جن میں سے ۳۵ لاکھ یہودی اسرائیل میں آباد ہیں۔ اتنی ہی تعداد میں یہودی امریکہ میں ہیں جبکہ باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سیاست کا رشتہ مذہب سے برقرار رہے تو یہود کو اپنے پیش نظر مقاصد میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں ایک نہایت قلیل اقلیت کیا کر سکتی ہے؟ لہٰذا یہود نے سیاست اور مذہب کے باہمی رشتے کو منقطع کر دیا۔ اس ضمن میں جو آرڈر آف ایلومیناٹی (Order of Illuminati) تشکیل دیا گیا تھا اس کا insignia آج بھی ایک ڈالر کے نوٹ پر موجود ہے۔ یہود نے بڑی طویل محنت کے بعد سیکولرازم کو دنیا میں رائج کیا ہے۔ یہودی مذہب غیر تبلیغی مذہب ہے۔ وہ کسی دوسرے مذہب کے پیروکار کو یہودی بناتے ہی نہیں، کیونکہ یہودیت نسل پر مبنی ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ عیسائیت میں تفریق پیدا کر دیں، جیسے مسلمانوں میں عبداللہ بن سبا نامی ایک یہودی نے تفریق پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ یہود نے عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے پہلے عیسائیوں کے عہدِ اقتدار میں سود کی مکمل ممانعت تھی، لیکن پروٹسٹنٹس کے ذریعے یہودیوں نے سود کو جائز کروالیا۔ اس سودی نظام کی وجہ سے آج جس طرح پوری دنیا کی معیشت عالمی مالیاتی اداروں کی گرفت میں ہے اسی طرح ڈیڑھ

صدی قبل یورپی ممالک کی معیشت پر یہود مسلط ہو چکے تھے۔ علّامہ اقبال نے اپنے سفر یورپ میں اسی صورت حال کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے''۔ سیکولرازم کا نظریہ مذہب اور ریاست کی جدائی کا نام ہے جسے اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری!

دیگر مذاہب کے برعکس اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ مکمل دین اور نظامِ زندگی ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ایسی شے جو اس نظام کو نقصان پہنچاتی ہو اس کا سدِباب ضروری ہے۔

مسئلۂ ارتداد اور مرتد کی سزا

ارتداد کا مسئلہ کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران مدینہ کے یہود نے جب دیکھا کہ جو شخص ایک دفعہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا ہے، پھر اس سے علیحدہ ہی نہیں ہوتا تو انہوں نے سوچا کوئی ایسی چال چلنی چاہیے جس سے اسلام کی دھاک اور ساکھ مجروح ہو جائے۔ چنانچہ بعض یہودی صبح اسلام لاتے اور شام کو مرتد ہو جاتے تاکہ لوگوں کو اسلام سے متنفر کیا جا سکے۔ اسلام اگر محض ایک مذہب ہوتا تو مسلمانوں کے لیے ترکِ اسلام کے راستے کو کھلا رکھنے سے کوئی فرق واقع نہ ہوتا، لیکن اسلام تو درحقیقت ایک مکمل ریاستی نظام بھی ہے، لہٰذا ارتداد کا فتنہ اسلامی ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے نہایت مؤثر ہتھیار ثابت ہوتا۔ چنانچہ اس فتنے کا سدباب کرنے کے لیے ''مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ'' (صحیح البخاری) کا حکم جاری کر دیا گیا۔ پس اسلامی ریاست کی حدود میں کوئی مسلمان اگر مرتد ہو جاتا ہے تو وہ واجب القتل ہے۔

قتلِ مرتد کی سزا اُن لوگوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتی جو مذہب اور ریاست کو جدا سمجھتے ہیں۔ اسلامی ریاست کی بنیاد ہی مذہب ہے، لہٰذا مذہب سے بغاوت درحقیقت اسلامی ریاست سے بغاوت کے مترادف ہے۔ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اگر ریاست کے نظریہ ہی کو کمزور کر دیا جائے تو پھر خود ریاست ہی کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام کا نظامِ حیات‘ اس کا سارا قانونی ڈھانچہ رسالت و نبوتِ محمدی ﷺ پر استوار ہے۔ ایک شخص پکا موحد بھی ہو اور اُس کے اخلاق بھی اچھے ہوں لیکن اگر وہ آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کو تسلیم نہیں کرتا تو عقیدۂ توحید کے باوجود وہ غیر مسلم قرار پائے گا۔ کوئی شخص کتنا ہی متقی‘ عابد اور زاہد کیوں نہ ہو جب تک رسالتِ محمدی ﷺ کا قلادہ اس کی گردن میں نہیں ہوگا‘ وہ ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علّامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

دین تو نام ہی محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ شریعت کا سارا وجود ہی آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسلام کا پورا نظام محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے گرد گھومتا ہے۔ اگر اس تعلق کو مجروح کر دیا جائے تو گویا اسلام کی پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ کے ساتھ ایک بندۂ مؤمن کے رشتے اور تعلق کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان پر ایمان لاؤ‘ ان کی مکمل اطاعت کرو اور تمام انسانوں سے بڑھ کر انہیں محبوب سمجھو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (متفق علیہ) ’’تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مَیں اُسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اُس کے والد سے‘ اُس کی اولاد سے‘ یہاں تک کہ تمام انسانوں سے‘‘۔ بدقسمتی سے آج ایمان کی یہ بنیادی شرائط بھی اُمّت کی عظیم اکثریت کے ذہنوں سے نکل چکی ہیں۔ عمومی تصوّر یہ ہے کہ عید میلاد مناؤ‘ نعتیں پڑھو‘ جلسے کر لو‘ سیرت کانفرنسیں کر لو‘ مگر جہاں تک اتّباعِ رسولؐ‘ اطاعتِ رسولؐ اور محبّتِ رسولؐ کا معاملہ ہے اس سے اُمّت بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ محبّت کا تعلق دل سے ہے جو دکھائی نہیں دیتی‘ جبکہ اطاعت کا تعلق عمل سے ہے جو نظر آتا ہے۔ ایک اور ضروری شے نبی اکرم ﷺ کا ادب و احترام ہے جسے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے۔ بقولِ شاعر ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرے کی دو بنیادیں ہیں: ایک قانونی اور دوسری قلبی اور جذباتی۔ قانونی بنیاد کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات سے سرتابی نہ کی جائے‘ ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مسلمان فرد ہو یا ریاست دونوں قرآن و سُنّت کے دائرے کے اندر اندر آزاد ہیں لیکن انہیں اس سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسری جانب حضور ﷺ کا ادب و احترام اسلام کے نظامِ معاشرت اور اسلامی تہذیب میں یک رنگی اور تسلسل کا ضامن ہے۔ اسلامی معاشرے کے استحکام کے لیے ایک ستون اگر دستوری و قانونی ہے تو دوسرا ستون حضور ﷺ سے جذباتی محبّت اور آپؐ کا اتباع ہے۔ اگر حضور ﷺ کا ادب و احترام اور آپؐ کے اتّباع کا جذبہ کمزور پڑ جائے تو اسلامی تہذیب کی بنیاد ختم ہو کر رہ جائے گی۔

مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے وضع کردہ ’’دینِ الٰہی‘‘ کے اندر بھی یہی فتنہ مضمر تھا۔ اُس وقت یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ دین کی اصل توحید ہی ہے‘ رسالت وغیرہ کی چنداں اہمیت نہیں۔ چنانچہ اس سے اُمّتِ محمد ﷺ کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اس فتنے کی سرکوبی کے لیے مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوئے۔ بقول اقبال ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار!

شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب میں اتباعِ سُنّت پر جس قدر زور دیا گیا ہے اُس کا عام آدمی تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

اگر توہین رسالت کا قانون موجود نہ ہو تو اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ ہماری معاشرتی اور ملی زندگی کے جذباتی مرکز و محور کو منہدم کر دیں۔ اس سے مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ چنانچہ علّامہ اقبال نے ’’ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام‘‘ بایں الفاظ نقل کیا ہے ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
رُوحِ محمدؐ اُس کے بدن سے نکال دو!

قادیانی فتنے کی سرکوبی کا اصل ذریعہ

غیر مسلم قرار دیے جانے کے باوجود قادیانی فتنے کا پوری طرح سدِّباب نہیں ہوسکا اور یہ فتنہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ خفیہ طور پر اب پاکستان میں بھی مسلمانوں کو قادیانی بنایا جارہا ہے۔ پوری دنیا میں قادیانی اُمّت کا بول بالا ہے۔ قادیانی جماعت کے سربراہ کے خطبات سیٹلائٹ پر نشر ہورہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہورہا ہے کہ ہم پاکستان میں half way تو چلے گئے کہ ہم نے انہیں غیر مسلم قرار دے دیا مگر اس فتنے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے ''قتلِ مرتد'' کی سزا نافذ نہیں کی۔ قتلِ مرتد کے قانون کے نفاذ کے بعد جو مسلمان قادیانیت کو اختیار کرے گا تو وہ مرتد شمار کیا جائے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ جب تک ''قتلِ مرتد'' کی سزا کا نفاذ نہیں کیا جاتا' اُس وقت تک قادیانی فتنے کو روکا نہیں جاسکتا۔ غیر مسلم قرار دیے جانے کے بعد قادیانی ٹولے نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور پوری دنیا میں انسانی حقوق کے حوالے سے ہمدردی حاصل کر رکھی ہے کہ پاکستان میں ہمیں مسلم تسلیم نہیں کیا جاتا' ہمیں کلمہ پڑھنے سے روکا جاسکتا ہے' ہمیں مساجد کی تعمیر کی اجازت نہیں ہے۔ مَیں نے کئی مواقع پر مجلس عمل ختم نبوت کے ذمہ داران سے بھی کہا ہے کہ جب تک آپ ''قتلِ مرتد'' کا قانون منظور کرانے کے لیے مورچہ بند نہیں ہوں گے اُس وقت تک قادیانی فتنے کا انسداد ناممکن ہے۔

جناب اسماعیل قریشی پوری ملّتِ اسلامیہ کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں سے ملکی قانون میں توہین رسالت کے جرم کے لیے سزائے موت (capital punishment) نافذ کروادی گئی۔ تو کیا اسی طرح پاکستان میں ''قتلِ مرتد'' کی سزا نافذ نہیں ہوسکتی؟

پاکستان میں قانون تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کی جو مخالفت ہورہی ہے وہ بظاہر عیسائی کررہے ہیں مگر حقیقت میں اس کے پسِ پردہ قادیانی لابی سرگرم عمل ہے۔ عالمی سطح پر بھی

قادیانی متحرک ہیں۔ قادیانی عیسائیت کے آلۂ کار بن چکے ہیں اور عیسائیت یہود کی آلۂ کار ہے۔ گویا توہینِ رسالت کے قانون کی مخالفت اصل میں یہودی سازش ہے۔ یہود نے عالَمِ عیسائیت کو مفتوح کرلیا ہے اور برطانیہ' فرانس' امریکہ کی سرپرستی کی وجہ سے دنیا میں یہود کا ڈنکا بج رہا ہے۔ قادیانیوں کو یہ تشویش لاحق ہے کہ اگر پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی جانب مزید پیش رفت ہوئی تو یہاں ''قتلِ مرتد'' کا قانون بھی نافذ ہوجائے گا۔ گویا پاکستان میں نفاذِ اسلام قادیانیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قادیانی کہتے ہیں کہ آنجنابؑ نے کشمیر میں آکر وفات پائی ہے اور وہاں اُن کی قبر بھی موجود ہے۔ گویا وہ نہ تو حضرت مسیح علیہ السلام کے رفعِ سماوی کے قائل ہیں اور نہ ان کی دوبارہ آمد کے۔ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی اس بات کا مدعی تھا کہ خود مَیں مثیلِ مسیح ہوں۔ مرزا قادیانی نے کہا کہ مسیح علیہ السلام دوبارہ نہیں آئیں گے' بلکہ ان کی سی صفات رکھنے والا شخص آئے گا اور وہ مَیں ہی ہوں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اس حوالے سے عقائد کے ضمن میں قادیانیوں کا عیسائیوں سے کس قدر بُعد ہے' جبکہ مسلمانوں کا عیسائیوں سے بہت زیادہ قرب ہے۔ اگر اس کے باوجود عیسائی قادیانیوں کے آلۂ کار بنیں تو یہ بہت افسوس ناک بات ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین○○

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 160 روپے، اشاعت عام 80 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الرَّحْمٰن

تمہیدی کلمات

قبل ازیں سورۂ قٓ کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ زیر مطالعہ سات مکّی سورتوں میں سے سورۂ قٓ منفرد ہے جبکہ باقی چھ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پہلا جوڑا سورۃ الذّاریات اور سورۃ الطور کا ہے' دوسرا سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا اور تیسرا سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا۔ چنانچہ اب ہم ان میں سے تیسرے جوڑے کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں (سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ) اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت' رسالت اور وحی کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ پھر سورۃ الرحمٰن پورے قرآن میں واحد ایسی سورت ہے جس میں جنّوں اور انسانوں سے مسلسل اور متوازی خطاب ہو رہا ہے۔

اس حوالے سے ضمنی طور پر یہاں ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیں کہ جنّوں کے ہاں نبوت اور وحی کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ''عالَمِ خلق'' (دنیا) میں وحی الٰہی کے نزول کی متحمل صرف ''روح'' ہو سکتی ہے اور روح اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں کو عطا کی ہے۔ جنّوں میں روح نہیں ہوتی۔ اس لیے جنّات ان ہی انبیاء و رسل علیہم السلام کے پیروکار رہے ہیں جو انسانوں کی طرف مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان میں اہلِ ایمان اور کافر جن بھی ہیں اور نیک و بد بھی۔ سورۃ الاحقاف میں ہم جنّات کی ایک جماعت کا ذکر پڑھ آئے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کے ماننے والے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قرآن سن کر ایمان لائے اور پھر انہوں نے ایمان و قرآن کی دعوت اپنی قوم تک بھی پہنچائی۔ بہرحال سورۃ الرحمٰن اس حوالے سے پورے قرآن میں منفرد سورت ہے کہ اس میں جنّوں اور انسانوں سے خطاب کے لیے بار بار تثنیہ کا صیغہ آیا ہے' بلکہ خصوصی طور پر یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے الفاظ میں بھی خطاب ہوا ہے۔ اس طرح اس

سورت میں تخصیص کے ساتھ واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ان دونوں نسلوں کے افراد ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید میں جہاں کہیں یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کے الفاظ میں خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد اگرچہ نوعِ انسانی ہے لیکن اس صیغہ تخاطب میں جِنّوں کو انسانوں کے تابع سمجھا جائے گا' چنانچہ ایسے ہر خطاب میں انسانوں کے ساتھ جن بھی مخاطب ہیں۔

سورۃ الرحمٰن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دو دو جنّتوں کا دو مرتبہ تذکرہ ہے اور سورۃ الواقعہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین کی ترتیب میں ایک انوکھی اور عجیب مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس ترتیب کو معکوس ترتیب یا mirror image کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک سورۃ کے مضامین جس ترتیب سے آئے ہیں دوسری سورت میں وہی مضامین اس کے برعکس ترتیب میں ہیں۔ آج کل بعض لوگ جڑواں گھر اس طرح بناتے ہیں کہ دونوں کا نقشہ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن ایک گھر میں کمروں وغیرہ کی location کی ترتیب دوسرے کی ترتیب کے برعکس ہوتی ہے۔ اس طرح ایک گھر دوسرے گھر کا mirror image محسوس ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین اور ان مضامین کی ترتیب میں گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔

سورۃ الرحمٰن کی ترجیعی آیت ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ ہے جو اس سورت میں ۳۱ مرتبہ آئی ہے' جبکہ اس سورت کی کُل آیات ۷۸ ہیں۔ آیات کی ترجیع کا اسلوب اگرچہ قبل ازیں ہم سورۃ الشعراء اور سورۃ القمر میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں یہ دو آیات آٹھ بار دہرائی گئی ہیں: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝﴾ جبکہ سورۃ القمر میں ان دو آیات کی تکرار چار مرتبہ آئی ہے: ﴿فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾۔ بہرحال یہ خاص اسلوب سورۃ الرحمٰن میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

آیات ۱ تا ۲۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ﴿۴﴾

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۬ۙ﴿۵﴾ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ﴿۶﴾

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾ وَالْاَرْضَ
وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾
وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۙ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ
مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ
الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾
مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَـَٔاتُ فِي الْبَحْرِ
كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

آیت ۱ ﴿اَلرَّحْمٰنُ ①﴾ ''رحمٰن نے''

آیت ۲ ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ②﴾ ''قرآن سکھایا۔''

رحمٰن اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔ اس کا مادہ ''رحم'' ہے اور یہ فَعلان کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں ان کے مفہوم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دو مرتبہ (الاعراف: ۱۵۰ اور طٰہٰ:۸۶) غَضْبَان کا لفظ آیا ہے' یعنی غصے سے بہت زیادہ بھرا ہوا۔ اسی طرح اَنَا عَطْشَان کا مطلب ہے کہ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں اور اَنَا جَوْعَان: بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے رحمٰن کے مفہوم میں ایک طوفانی شان پائی جاتی ہے (لفظ ''طوفان'' بھی اسی وزن پر ہے' اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں بھی مبالغہ پایا جاتا ہے)۔ اس مفہوم کو ہم اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ کسی مخلوق کا کوئی فرد بھی اس کی رحمت سے مستغنی نہیں۔ خاص طور پر بنی نوعِ انسانی تو دنیا میں بھی اُس کی رحمت کی محتاج ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص صرف

اپنے اعمال کی بنیاد پر جنّت میں نہیں جا سکے گا جب تک کہ رحمتِ خداوندی اُس کی دستگیری نہ کرے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! کیا آپؐ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ((وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِمَغْفِرَةٍ وَرَحْمَةٍ))[1] ''ہاں میں بھی نہیں' اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں رحمٰن چوٹی کا نام ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام رحمٰن ہے' اسی طرح اللہ نے انسان کو جو علم سکھایا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے۔ اکتسابی علم (acquired knowledge) میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق انسان رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو الہامی علم (revealed knowledge) عطا ہوا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے' جو ہر قسم کے تمام علوم کا نقطۂ عروج ہے۔

آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③﴾ ''اُسی نے انسان کو بنایا۔''

اس سلسلے کا تیسرا اہم نکتہ یہ نوٹ کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج (climax) انسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے عالَمِ امر اور عالَمِ خلق (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ النحل' آیت ۴۰ کی تشریح) دونوں کو جمع فرما دیا ہے۔ اسی لیے انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص:۷۵) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔

آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④﴾ ''اس کو بیان سکھایا۔''

یعنی اسے بولنا سکھایا' اسے گویائی کی صلاحیت بخشی۔ آیات زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں میں سے جو چوٹی کی صلاحیت ہے وہ قوتِ بیان (گویائی) ہے۔ آج میڈیکل سائنس کی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسان کی قوتِ گویائی کا تعلق اس کے دماغ کی خصوصی بناوٹ سے ہے۔ سائنس کی زبان میں تو انسان بھی حیوان ہی ہے' لیکن اس کے بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے اسے حیوانِ ناطق (بولنے والا حیوان) کہا گیا ہے۔

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب القصد والمداومة علی العمل' ح:۶۴۶۷۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بعمله بل برحمة الله تعالیٰ' ح:۲۸۱۶۔

دماغ تو ظاہر ہے انسان سمیت تمام جانوروں میں موجود ہے‘ لیکن ہر جانور کے دماغ کی بناوٹ اور صلاحیت مختلف ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا دماغ تمام حیوانات کے دماغوں میں سب سے اعلیٰ ہے اور اس میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں جو کسی اور جانور کے دماغ میں نہیں ہیں۔ بہرحال استعداد کے حوالے سے حیوانی دماغ کی بناوٹ نچلی سطح سے ترقی کر کے گوریلوں اور چیمپنزیز (champenzies) کے دماغ کی سطح تک پہنچتی ہے‘ اور پھر اس ترقی کی معراج انسان کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ کے مختلف حصّے ہیں‘ مثلاً سماعت سے متعلقہ حصّہ‘ بصارت سے متعلقہ حصّہ وغیرہ۔ حواس (آنکھ‘ کان وغیرہ) سے حاصل ہونے والی معلومات پہلے دماغ کے متعلقہ حصّے میں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے gray matter کے پچھلے حصّے میں پہنچتی ہیں۔ لیکن انسانی دماغ کا سب سے اہم اور بڑا حصّہ speech centre ہے‘ اور پھر اس میں بھی کلام کے فہم اور ابلاغ سے متعلق دو الگ الگ حصّے ہیں‘ یعنی ایک حصّے میں دوسروں کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے جبکہ دوسرا حصّہ دوسروں تک بات پہنچانے سے متعلق ہے۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے‘ لیکن قوتِ گویائی کے علاوہ انسان کی باقی تقریباً تمام صلاحیتیں کسی نہ کسی سطح پر کسی نہ کسی درجے میں دوسرے حیوانات کو بھی ملی ہیں‘ بلکہ بعض حیوانات کی بعض صلاحیتیں تو انسان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ بعض جانوروں کی بصارت ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ تیز ہے‘ کئی جانور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دیکھنے کے لیے روشنی کے محتاج ہیں۔ گھوڑے کی قوتِ سماعت انسان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ذرا سی آہٹ پر گھوڑے کے کان (antenna کی طرح) کھڑے ہو جاتے ہیں‘ جبکہ گھڑسوار نے ابھی کچھ دیکھا ہوتا ہے نہ سنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کُتّوں کے دماغ میں سونگھنے کا حصّہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سونگھنے کی حس انسان کے مقابلے میں سو گنا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بہرحال باقی صلاحیتیں تو دوسرے جانوروں میں بھی پائی جاتی ہیں‘ لیکن بیان اور گویائی کی صلاحیت صرف اور صرف انسان کا طُرّۂ امتیاز ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ان آیات کو دوبارہ پڑھیے۔ ان چار آیات سے تین جملے بنتے ہیں۔ پہلی آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝۱﴾ جملہ نہیں ہے‘ یہ مبتدأ ہے اور ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲﴾ اس کی خبر ہے۔ چنانچہ پہلی اور دوسری آیت کے ملنے سے مکمل جملہ بنتا ہے۔ یعنی ’’رحمٰن نے قرآن سکھایا‘‘۔

اس کے بعد آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳﴾ ’’اُس نے انسان کو پیدا کیا‘‘ بھی مکمل جملہ ہے اور آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴﴾ ’’اسے بیان کی صلاحیت عطا کی‘‘ بھی مکمل جملہ ہے —— اب ان آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے اعلیٰ نام کے حوالے سے سب سے اعلیٰ علم (قرآن) کا ذکر کیا۔ پھر اپنی چوٹی کی مخلوق اور اس مخلوق کی چوٹی کی صلاحیت (بیان) کا ذکر کیا۔ اس زاویے سے غور کیا جائے تو یہ تین جملے ریاضی کے کسی سوال کی طرح ’’جواب‘‘ کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ریاضی کے ’’نسبت وتناسب‘‘ کے سوالات میں تین رقموں (values) کی مدد سے چوتھی رقم معلوم کی جاتی ہے‘ اسی طرح ان تین جملوں پر غور کرنے سے اس عبارت کے اصل مدّعا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ’’رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی صلاحیت عطا فرمائی‘‘۔ کس لیے؟ —— جواب بالکل واضح ہے: ’’قرآن کے بیان کے لیے!‘‘ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ ترین مخلوق کو ’’بیان‘‘ کی انمول صلاحیت سے اس لیے تو نہیں نوازا کہ وہ اسے لہو ولعب میں ضائع کرتا پھرے‘ یا دلائل کے انبار لگانے والا وکیل یا شعلہ بیان مقرر بن کر اسے حصولِ دولت وشہرت کا ذریعہ بنا لے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ توپ اس لیے تو نہیں بنائی جاتی کہ اس سے مکھیاں ماری جائیں۔ چنانچہ انسان کی اس بہترین صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوگا کہ وہ اسے بہترین علم کے سیکھنے سکھانے کا ذریعہ بنائے۔ یعنی اپنی قوتِ بیان کو قرآن کی تعلیم اور نشر واشاعت کے لیے وقف کر دے۔ ان آیات کے اس مفہوم کو حضور ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))[۲] یہاں خَيْرُكُمْ کا صیغہ تفضیلِ کُل (superlative degree) کے مفہوم میں آیا ہے کہ تم سب میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث کے حوالے سے ضمنی طور پر یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس کے راوی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام اور حدیث کے لفظ ’’قرآن‘‘ کے قافیے بھی زیرِ مطالعہ آیات کے قافیوں کے ساتھ مل رہے ہیں۔ یعنی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس حدیث کی ان آیات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی ان ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر سورۃ القمر کی ترجیعی آیت ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ ...﴾ کے مفہوم اور اس کے پُرشکوہ اسلوب کو بھی مدِّنظر رکھا جائے اور ان آیات کی ترتیب پر بھی غور کیا جائے کہ سورۃ القمر کی

۲۔ صحیح البخاری‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔

مذکورہ آیت کو بار بار دہرانے کے فوراً بعد سورۃ الرحمٰن کی یہ آیات آئی ہیں تو ان آیات کا مذکورہ مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے۔ بہرحال ان آیات کے بین السطور یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا حق ادا کرنا لازم ہے۔

آیت ۵ ﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵﴾ ''سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔''

سورج اور چاند کی گردش ایک قطعی اور مربوط نظام کا حصّہ ہے۔ ان کی گردش سے ہی دن رات بنتے ہیں اور دنوں' مہینوں اور سالوں کا حساب ممکن ہوتا ہے۔

آیت ۶ ﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶﴾ ''اور ستارے اور درخت (اللہ کو) سجدہ کرتے ہیں۔''

نَجْم کے معروف معنی ستارے کے ہیں' لیکن عربی میں یہ لفظ ایسے پودوں اور بیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تنا نہیں ہوتا۔ مثلاً جھاڑیاں اور خربوزے اور تربوز کی بیلیں وغیرہ۔ جس طرح لاتعداد ستارے آسمان پر بکھرے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح بے شمار جھاڑیاں اور بیل بوٹے زمین پر پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی آیت میں سورج اور چاند کے ذکر کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہاں النَّجْم سے ستارے مراد ہوں گے' لیکن اگلے لفظ الشَّجَر کے حوالے سے جھاڑیاں یا بیلیں کا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آیت ۷ ﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷﴾ ''اور آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کی۔''

یہاں میزان سے مراد کائناتی نظام کے اندر پایا جانے والا مربوط اور خوبصورت توازن (cosmic balance) ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ توازن تمام اجرامِ سماویہ کے اندر موجود کششِ ثقل (gravitational force) کی وجہ سے قائم ہے۔ تمام اجرامِ فلکی اس کشش کی وجہ سے آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ قدرت کی طرف سے ہر کُرّے کا دوسرے کُرّے سے فاصلہ' اس کی کشش کی طاقت کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اگر کہیں یہ فاصلہ ایک طرف سے معمولی سا کم ہو جائے اور دوسری طرف سے معمولی سا بڑھ جائے تو یہ سارا نظام تلپٹ ہو جائے اور تمام کُرّے آپس میں ٹکرا جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تمام چیزوں

میں ایک توازن قائم کر رکھا ہے۔ ☆

آیت ۸ ﴿اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝۸﴾ ''تاکہ تم میزان میں زیادتی مت کرو۔''

اس کائناتی توازن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے تم بھی عدل و انصاف پر قائم رہو۔

آیت ۹ ﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝۹﴾ ''اور قائم رکھو وزن کو انصاف کے ساتھ اور میزان میں کوئی کمی نہ کرو۔''

کسی بھی نظام میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اس نظام کے اندر عدل قائم رکھنا یعنی اس کی ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنا ضروری ہے' کیونکہ کسی بھی قسم کی کمی بیشی نظام میں خرابی اور عدم توازن کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے زیادتی سے بھی منع کر دیا گیا (لَا تَطْغَوْا) اور کمی کرنے سے بھی روک دیا گیا (لَا تُخْسِرُوا)۔ خالقِ کائنات نے اس کائنات کا پورا نظام توازن اور عدل و قسط پر قائم کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار میں اسی طرح توازن اور عدل و قسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے' ورنہ سارے نظامِ معاش و معیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ یہاں کوئی بڑا ظلم تو درکنار' ترازو میں ڈنڈی مار کر اگر کوئی شخص خریدار کے حصّے کی تھوڑی سی چیز بھی مار لیتا ہے تو میزانِ عالَم میں خلل برپا کر دیتا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝۱۰﴾ ''اور زمین کو اُس نے بچھا دیا مخلوق کے لیے۔''

ظاہر ہے مخلوق میں انسان بھی شامل ہیں اور جِنّات بھی۔ نوٹ کیجیے کہ پہلے آسمان' سورج اور چاند کا ذکر ہوا ہے اور اب زمین کا۔ گویا ترتیب تدریجاً اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝۱۱﴾ ''اس میں میوے ہیں اور کھجوریں ہیں' جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔''

☆ علّامہ اقبال نے ''بانگِ درا'' کی نظم ''بزمِ انجم'' کے اس شعر میں اسی کائناتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے　　پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں!

(مرتّب)

آیت ۱۲ ﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور بُھس والا اناج بھی ہے اور خوشبودار پھول بھی۔''

بعض مترجمین ''الرَّیْحَان'' سے مختلف النوع غذائیں بھی مراد لیتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾﴾ ''تو تم دونوں (گروہ) اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

عام طور پر اٰلَآءِ کا ترجمہ ''نعمتیں'' کیا جاتا ہے' لیکن اس لفظ میں نعمتوں کے ساتھ ساتھ قدرتوں کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی اس لفظ سے کہیں اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور کہیں اُس کی قدرتیں۔ تُكَذِّبٰنِ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورت میں جنّوں اور انسانوں سے مسلسل ایک ساتھ خطاب ہو رہا ہے۔ آگے چل کر آیت ۳۳ میں يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے خطاب سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ (۳)

آیت ۱۴ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾﴾ ''اُس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹّی سے۔''

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے حوالے سے سورۃ الحجر کے تیسرے رکوع میں تین مرتبہ ﴿صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد ایسا گارا ہے جس میں سڑاند پیدا ہو چکی ہو' یعنی سنا ہوا گارا۔ ایسا گارا خشک ہونے پر سخت ہو جاتا ہے اور ٹھوکر لگنے سے کھنکنے لگتا ہے۔ یہاں پر صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ سے ایسا ہی سوکھا ہوا گارا مراد ہے' یعنی ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتا ہوا گارا۔

۳۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو سورۃ الرحمٰن شروع سے آخر تک سنائی تو وہ اسے سن کر خاموش رہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے لیلۃ الجن میں یہ سورت جنّوں کو سنائی تھی تو وہ تم سے بہتر جواب دینے والے تھے۔ میں جب بھی یہ آیت شریفہ پڑھتا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ تو وہ جواب میں کہتے: لَا بِشَیْءٍ مِنْ نِعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ' فَلَکَ الْحَمْدُ (پروردگار! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے' پس شکر و تعریف تیرے ہی لیے ہے)''۔ سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ الرَّحمٰن۔ (حاشیہ از مرتّب)

آیت ۱۵ ﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور جِنّات کو اُس نے پیدا کیا آگ کی لپٹ سے۔''

مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ سے آگ کی لو یا لپٹ مراد ہے۔ اس کا اطلاق آگ کے شعلے کے اس حصّے پر ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن انتہائی گرم ہوتا ہے۔ شعلے کے اندر سب سے زیادہ درجہ حرارت اسی نظر نہ آنے والے حصّے میں ہوتا ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۲۷ میں آگ کی اس لپٹ کو نَارِ السَّمُوْمِ کا نام دیا گیا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۱۷ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾﴾ ''وہ ربّ ہے دونوں مشرقوں کا اور دونوں مغربوں کا۔''

یہاں پر رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ اور رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ تثنیہ کے اس صیغہ کی مناسبت سے آیا ہے جو پوری سورت میں بار بار آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ﴾ (المزمل:۹) اور ﴿رَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ (المعارج:۴۰) کی تراکیب بھی آئی ہیں۔ بہرحال واحد' تثنیہ اور جمع کے یہ تینوں صیغے اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ واحد کے صیغے میں مشرق اور مغرب تو معروفِ عام ہیں۔ دو مشرقوں اور دو مغربوں کے تصوّر کو یوں سمجھیں کہ ایک وقت میں سورج جہاں سے طلوع ہو رہا ہے گلوب کی دوسری طرف وہیں پر وہ غروب ہوتا بھی نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح جس نقطے پر سورج غروب ہوتا نظر آتا ہے دوسری طرف اسی جگہ سے طلوع ہوتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ گویا سورج طلوع ہونے کا ہر نقطہ مقامِ غروب بھی ہے اور اسی طرح ہر مقامِ غروب گویا مقامِ طلوع بھی ہے۔ اس لحاظ سے گویا مشرق بھی دو ہیں اور مغرب بھی دو۔ پھر کسی ایک مقام سے بظاہر نظر آنے والے مشرق و مغرب کے درمیان زمین پر ہر ہر نقطہ گلوب میں کسی کے لیے مقامِ طلوع ہے اور کسی کے لیے مقامِ غروب۔ اس طرح گویا بہت سے مشرق ہیں اور بہت سے مغرب۔

آیت ۱۸ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۱۹ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾﴾ ’’اُس نے چلا دیے دو دریا جو آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾﴾ ’’لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔‘‘

دونوں دریا باہم مل کر چلتے ہیں لیکن ایک دوسرے میں گھستے نہیں‘ اپنی اپنی حد میں رہتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈے پانی کے سمندروں میں گرم پانی کی روئیں بہتی ہیں اور کھاری سمندروں میں میٹھے پانی کی روئیں بہتی ہیں۔ اسی طرح کئی دریا باہم ملتے ہیں لیکن دور تک الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں دریائے کابل کا پانی جب دریائے سندھ میں ملتا ہے تو بہت دور تک دونوں پانی اپنے رنگ کی وجہ سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ اٹک کے پُل پر کھڑے ہو کر دونوں پانیوں کا الگ الگ رہتے ہوئے ایک ساتھ چلنے کا یہ منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی منظر مظفر آباد کے قریب ’’دومیل‘‘ کے مقام پر نظر آتا ہے جہاں دریائے نیلم دریائے جہلم میں ملتا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۲۲ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾﴾ ’’ان دونوں سے نکلتے ہیں موتی بھی اور مونگے بھی۔‘‘

آیت ۲۳ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۲۴ ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَـَٔاتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾﴾ ’’اور اُسی کے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی مانند اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔‘‘

یعنی اُسی کی قدرت کا نمونہ ہیں اور اُسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ پچھلے زمانے کے جہاز اگرچہ دورِ جدید کے جہازوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے تھے‘ لیکن جب ان کے بادبان کھلتے تھے تو وہ بھی اونچائی میں پہاڑوں جیسے نظر آتے تھے۔ اور آج کل کے جہاز تو واقعتاً پہاڑوں سے مشابہ ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟‘‘

یہاں ایک دفعہ پھر نوٹ کر لیں کہ سورت کے آغاز سے لے کر اب تک جو آیات ہم نے پڑھی ہیں ان میں پہلے قرآن کی عظمت کا ذکر آیا ہے اور اس کے بعد اللہ کی صنّاعی اور اس کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ابتدائی آیات میں انسان کی قوتِ بیان کے تذکرے کے ساتھ قرآن کی عظمت کا ذکر کر کے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اس کی اس صلاحیت کا بہترین مصرف یہی ہے کہ وہ قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس کی مزید وضاحت نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ملتی ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔ بہرحال انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو بہترین طور پر صَرف کرے۔ علّامہ اقبال کے اس شعر میں اسی جذبے کو ترغیب و تحریک دی گئی ہے:

اگر یک قطرہ خوں داری‘ اگر مُشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را!

(کہ اے ننھی چڑیا! اگر تیرے پاس چند پَر ہیں اور ایک قطرۂ خون بھی ہے تو میرے پاس آؤ‘ میں تجھے شاہین کی سی اڑان کا طریقہ سکھا دوں!)

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ یہ موضوعات (قرآن کی عظمت اور اللہ کی صنّاعی کا بیان) ہم سورۃ الواقعہ میں بھی پڑھیں گے‘ لیکن وہاں ان کی ترتیب سورۃ الرحمٰن کے مضامین کی ترتیب کے بالعکس ہے۔ یعنی قرآن کی عظمت کا بیان جو سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں ہے سورۃ الواقعہ میں بالکل آخر پر ہے۔ پھر سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ کی خلّاقی و صنّاعی کا ذکر عظمتِ قرآن کے بعد ہے جبکہ سورۃ الواقعہ میں یہ موضوع عظمتِ قرآن کے ذکر سے پہلے بیان ہوا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں میں ایک جیسے موضوعات بیان ہوئے ہیں لیکن معکوس ترتیب سے۔ اس ترتیب کو قبل ازیں mirror image کا نام دیا گیا ہے۔

آیات ۲۶ تا ۴۵

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ
تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا
تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ
عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً
كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ
عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾
يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

آیت ۲۶ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾﴾ ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی اور بہت عظمت والا ہے۔''

اللہ کے چہرے کا تصوّر ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس لحاظ سے اگرچہ یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے لیکن اس کا عمومی مفہوم بالکل واضح ہے کہ باقی رہنے والی صرف ایک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے' جس کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور ان میں کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں جو اپنے بل پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہو۔ ہر چیز اور ہر مخلوق کا وجود اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کا مرہونِ منت ہے۔ جب تک وہ چاہتا ہے کسی چیز کا وجود برقرار رہتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے اسے فنا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القصص کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اُس کے چہرے کے۔ فرماں روائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۸ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۲۹ ﴿يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اُسی سے مانگتا ہے جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اللہ ہی کے در کی سوالی ہے۔ ہر کسی کو وجود بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ہر زندہ وجود کی زندگی بھی اُسی کی دین ہے' کسی مخلوق میں اگر کوئی صلاحیت ہے تو وہ بھی اُسی کی بخشی ہوئی ہے اور تمام مخلوقات کے ایک ایک فرد کی ضرورتوں کا خبر گیر و نگہبان بھی وہی ہے۔ اس حوالے سے سورۂ محمد کی آیت ۳۸ کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں: ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ﴾ کہ اللہ غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اُس کے محتاج ہو۔ یعنی تمہارا وجود' تمہاری زندگی' تمہاری صلاحیتیں' غرض تمہارا سب کچھ اُسی کا عطا کردہ ہے۔ تم اپنے تمام تر وسائل سے بس وہی کچھ کر سکتے ہو جس کی وہ اجازت دیتا ہے اور صرف اسی قدر جان سکتے ہو جس قدر وہ چاہتا ہے۔ اُس کی مخلوق کے تمام افراد پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) کہ وہ سب کے سب اُس کے احاطہ علم میں مقید و محصور ہیں اور وہ اُس کی معلومات میں سے کسی چیز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے' مگر اسی قدر جس قدر وہ چاہتا ہے۔

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾﴾ ''ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔''

ہر دن اُس کی ایک نئی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تدبیرِ امر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۃ السجدۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾﴾ ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف' (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہے''۔ یعنی کائنات اور مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا' بلکہ اس کائنات کے نظام اور ارض و سماء میں پھیلی ہوئی مخلوقات سے متعلق تمام امور کو وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی تدبیر سے چلا رہا ہے۔ اس تدبیر کی منصوبہ بندی کے لیے اُس کا ایک دن ہمارے ایک ہزار

سال کے برابر ہے۔ چنانچہ اُس کے ہاں ایک ایک دن کی منصوبہ بندی ہوتی ہے‘ اہم فیصلے کیے جاتے ہیں‘ احکام جاری ہوتے ہیں‘ ان احکام کی تعمیل و تنفیذ عمل میں لائی جاتی ہے اور پھر جائزہ رپورٹیں اُسے پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر دن کے لیے اُس کی نئی شان ہے اور نئی مصروفیات!

آیت ۳۰ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۳۰﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟‘‘

آیت ۳۱ ﴿سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ ۳۱﴾ ’’ہم جلد ہی فارغ ہو جائیں گے تمہارے لیے‘ اے دو بھاری قافلو!‘‘

اس آیت میں اشارۃً اور آگے آیت ۳۳ میں باقاعدہ نام لے کر تثنیہ (تُکَذِّبٰن) کے صیغے کی وضاحت کر دی گئی کہ اے جِن وانس کے قافلوں کے افراد! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ یاد رکھو! تم دونوں گروہ اپنے اعمال کے لیے ہمارے سامنے جواب دہ ہو۔ یاد رکھو! ہم اس کائنات کو ’’مہلت‘‘ کے اصول پر چلا رہے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے کائنات کی ایک عمر ﴿اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ مقرر کر رکھی ہے‘ اسی اصول کے تحت ہر قوم کو بھی ہم ایک وقتِ معیّن تک مہلت دیتے ہیں: ﴿لِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف:۳۴) اور ہر فرد کو بھی۔ چنانچہ ہماری عطا کردہ مہلت سے تم یہ مت سمجھو کہ تمہارا احتساب نہیں ہوگا‘ بلکہ ہم عنقریب تم سب لوگوں کو اپنے حضور حاضر کرنے والے ہیں‘ جہاں تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔

آیت ۳۲ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۳۲﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۳۳ ﴿یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ﴾ ’’اے گروہِ جن وانس! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل بھاگو تو نکل بھاگو۔‘‘

﴿لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۳۳﴾ ’’تم نکل نہیں سکو گے مگر (اللہ کی) سند کے ساتھ۔‘‘

یہ آیت مشکلات القرآن میں سے ہے۔ جب تک کائنات (cosmos) کی وسعتوں کے بارے میں انسان کا علم مزید ترقی نہیں کر جاتا‘ اس آیت کا مفہوم شاید ہم پوری طرح سمجھ نہ پائیں۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اپنی تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک انسان زمین کی ’’حدود‘‘ سے نکل کر نظامِ شمسی کے کسی ایک سیارے تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی اس رفتار سے تو یہی لگتا ہے کہ نظامِ شمسی کی وسعتوں تک بھی اس کی رسائی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ جہاں تک اس معاملے میں جِنّوں کی ’’استطاعت‘‘ کا تعلق ہے اس کے بارے میں قبل ازیں سورۃ الحجر کی آیت ۱۷ کے ضمن میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ وہ نظامِ شمسی کی حدود کے اندر آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں‘ لیکن نظامِ شمسی کی حدود کو پھلانگنے کی استطاعت وہ بھی نہیں رکھتے۔ دوسری طرف اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی وسعتوں کا عالَم یہ ہے کہ ان وسعتوں کے اندر خود نظامِ شمسی کی حیثیت ایک نقطے کی سی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں گروہِ جِن وانس کی اس بے بسی اور بے بضاعتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی طرف آیت زیر مطالعہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں جب آسمانوں اور زمین کا ذکر آتا ہے تو اس سے پوری کائنات مراد ہوتی ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں پوری کائنات کے کناروں سے نکل بھاگنے کے معنی معدوم ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ قیامت کے دن عذاب کے مستحق لوگ خواہش کریں گے: ﴿یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا ۴۲﴾ (النساء) ’’اُس دن تمنّا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور رسولؐ کی نافرمانی کی تھی کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے‘‘۔ لیکن ہمارا یہ وجود چونکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے‘ اس لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر یہ معدوم بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم میرے خیال میں یہ ہے کہ تم لوگ اگر معدوم بھی ہونا چاہو تو اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر (اِلَّا بِسُلْطٰنٍ) ایسا نہیں کر سکو گے۔ واللہ اعلم!

آیت ۳۴ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۳۴﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۳۵ ﴿یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۳۵﴾ ’’تم پر چھوڑے جائیں گے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اور دھواں‘ تو تم لوگ بدلہ نہیں لے سکو گے۔‘‘

آیت ۳۶ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۳۶﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی

نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۳۷ ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾ ’’پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی تیل کی تلچھٹ جیسا۔‘‘

آیت ۳۸ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۳۹ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾﴾ ’’تو اُس روز پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی‘ نہ کسی جِن سے اور نہ انسان سے اُس کے گناہوں کے بارے میں۔‘‘

اگرچہ سوال و جواب بھی ہوں گے اور ایک ایک عمل کا حساب بھی ہوگا‘ لیکن چونکہ ہر انسان اپنے اندرونی احوال کو خوب سمجھتا ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾﴾ (القیامۃ) اس لیے میدانِ حشر میں ہر شخص کا چہرہ ہی گویا اُس کے انجام کی خبر دے رہا ہوگا۔ اس کیفیت کا نقشہ قرآن مجید میں جابجا دکھایا گیا ہے‘ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے‘ جبکہ کچھ چہروں پر مردنی چھا رہی ہوگی۔ اس کیفیت کی عملی مثال ہمارے ہاں اسکولوں کے سالانہ نتائج کے اعلان کے موقع پر دیکھنے میں آتی ہے۔ چونکہ ہر طالب علم کو امتحان کے دوران اپنی کارکردگی کے بارے میں پہلے سے معلوم ہوتا ہے‘ اس لیے نتائج کے باقاعدہ اعلان سے پہلے ہی ہر ایک کا نتیجہ اس کے چہرے پر سے پڑھا جا سکتا ہے۔

آیت ۴۰ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۴۱ ﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾﴾ ’’پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے‘ پھر ان کو پکڑا جائے گا پیشانی (کے بالوں) سے اور پاؤں سے۔‘‘

اُس دن مجرمین کے اترے ہوئے چہرے ہی ان کی پہچان ہوں گے۔ چنانچہ فرشتے انہیں ٹانگوں اور پیشانی کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر جہنّم کی طرف اُچھالتے جائیں گے۔

آیت ۴۲ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۴۳ ﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ’’(اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جہنّم جسے مجرمین جھٹلایا کرتے تھے۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾﴾ ’’اب وہ چکر لگاتے رہیں گے اس (آگ) کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔‘‘

آگ کی تپش سے گھبرا کر پانی کی طرف لپکیں گے اور جب کھولتے ہوئے پانی کا مزہ چکھیں گے تو پھر واپس بھاگیں گے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ!

آیت ۴۵ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

یہ اہلِ جہنّم کا تذکرہ تھا‘ اب اس کے بعد آئندہ آیات میں اہلِ جنّت کا بیان ہوگا۔ البتہ سورۃ الواقعہ میں پہلے اہلِ جنّت کا ذکر ہے اور اس کے بعد اہلِ جہنّم کا۔ یعنی جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین باہم عکسی ترتیب میں ہیں۔

آیات ۴۶ تا ۷۸

وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦١﴾ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿٦٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٣﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿٦٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٥﴾ فِيْهِمَا
عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿٦٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٧﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ
وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿٦٨﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٩﴾ فِيْهِنَّ
خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ
مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ
يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾
مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

آیت ۴۶ ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿٤٦﴾﴾ ''اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لیے دو جنّتیں ہیں۔''

اہلِ جنّت کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کے حضور پیشی سے لرزاں و ترساں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا جادۂ مستقیم پر قائم رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کا خوف ہے۔

دو جنّتوں کے بارے میں مفسّرین نے مختلف آراء نقل کی ہیں' تاہم دو جنّتوں کی توجیہہ جو میری سمجھ میں آئی ہے اور مجھے اپنی اس رائے پر اطمینان اور انشراح ہے کہ یہ انسانوں اور جِنّوں کے لیے الگ الگ جنّتوں کا بیان ہے۔ چونکہ اس سورت میں خطاب بھی مسلسل ان دونوں سے ہے اور جہنّم کی وعید بھی دونوں گروہوں کو دی گئی ہے' اس لیے جنّت کی نوید بھی دونوں کے لیے ہونی چاہیے تھی۔ اب چونکہ انسانوں اور جِنّوں کا مادۂ تخلیق اور ان کی فطرتیں الگ الگ ہونے کی وجہ سے ان کی ضرورتیں' پسند و ناپسند' رنج و غم کے معیار' راحت و سکون کے پیمانے اور کیف و سرور کے انداز' سب کچھ ہی ایک دوسرے سے مختلف اور جُدا ہیں' اس لیے ظاہر ہے جنّت میں بھی ان کے لیے الگ الگ ماحول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ یہاں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ جنّتوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی مدِّنظر رہے کہ آیت زیر مطالعہ میں جن دو جنّتوں کا ذکر ہوا ہے وہ نچلے درجے کی جنّتیں ہیں' جبکہ آگے چل کر آیت ۶۲

میں جن دو جنّتوں کا ذکر ہوا ہے وہ اونچے درجے کی جنّتیں ہیں۔ گویا اس سورت میں کل چار جنّتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ہر گروہ کے لیے دو جنّتیں ہوں گی' ان میں سے ایک جنّت نچلے درجے میں ہوگی اور دوسری نسبتاً برتر درجے میں۔

آیت ۴۷ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٧﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۴۸ ﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿٤٨﴾﴾ ''دونوں بہت سی شاخوں والی ہوں گی۔''

آیت ۴۹ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٩﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۰ ﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿٥٠﴾﴾ ''ان دونوں میں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے۔''

یعنی ہر جنّت میں ایک ایک چشمہ رواں ہوگا۔

آیت ۵۱ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥١﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۲ ﴿فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿٥٢﴾﴾ ''ان دونوں میں ہر قسم کے میوے ہوں گے جوڑوں کی شکل میں۔''

یعنی ہر پھل کی دو قسمیں ہوں گی۔

آیت ۵۳ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٣﴾﴾ ''تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟''

آیت ۵۴ ﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ﴾ ''وہ وہاں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ایسے بچھونوں پر جن کے اَستر گاڑھے ریشم کے ہوں گے۔''

یہاں پر جنّت کے بچھونوں کے اندرونی کپڑے (اَستر) کا ذکر ہوا ہے کہ وہ گاڑھے یعنی موٹے ریشم کے بنے ہوں گے لیکن ان کے بیرونی غلافوں کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بیرونی غلافوں کی کیفیت ہمارے احاطہ خیال میں آ ہی نہیں سکتی۔

﴿وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿٥٤﴾﴾ ''اور دونوں جنّتوں کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے۔''

یعنی وہ اہلِ جنّت میں سے ہر ایک کی پہنچ میں ہوں گے۔

آیت ۵۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۵۶ ﴿فِیۡهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ﴾ ’’ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔‘‘

عورت کی جھکی ہوئی نگاہیں شرم و حیا کی علامت ہیں اور شرم و حیا نسوانیت کا خاص زیور بھی ہے اور اس کے اخلاق کا سب سے بڑا محافظ بھی۔ جنّتی عورتوں کی جھکی ہوئی نظروں کا ذکر گویا ان کے حسنِ ظاہری و باطنی کا بیان ہے۔

﴿لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾﴾ ’’ان کو چھوا نہیں ہو گا ان سے پہلے نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔‘‘

جنّتی جنّوں کی بیویاں ظاہر ہے انہی کی جنس سے ہوں گی جنہیں پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہو گا‘ جبکہ انسانوں کی بیویاں انسان ہوں گی اور انہیں بھی پہلے کسی انسان نے نہیں چھوا ہو گا۔

آیت ۵۷ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۵۸ ﴿کَاَنَّهُنَّ الۡیَاقُوۡتُ وَالۡمَرۡجَانُ ﴿۵۸﴾﴾ ’’وہ ایسی ہوں گی گویا لعل اور مونگے ہوں۔‘‘

آیت ۵۹ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۶۰ ﴿هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ﴿۶۰﴾﴾ ’’کیا بھلائی کا بدلہ بھلائی کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟‘‘

نیک لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے جو قربانیاں دیں‘ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے حوالے سے انہوں نے جو مشقتیں اٹھائیں‘ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کا بدلہ تو دینا ہے۔ لہٰذا جنّت کی مذکورہ نعمتوں کی صورت میں انہیں بدلہ دے کر اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں اور کوششوں کی قدر افزائی فرمائے گا۔

آیت ۶۱ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی

نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۶۲ ﴿وَمِنۡ دُوۡنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾﴾ ’’اور ان سے پرے دو جنّتیں اور بھی ہیں۔‘‘

مفسرین نے ان دو جنّتوں کی مختلف توجیہات کی ہیں‘ لیکن جیسا کہ قبل ازیں آیت ۴۶ کی تشریح میں ذکر ہو چکا ہے‘ میرے نزدیک ان میں سے دو جنّتیں جِنّوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ نچلے درجے میں ہیں اور دو جنّتیں ان دونوں گروہوں کے لیے الگ الگ اونچے درجے میں ہیں۔ اہلِ جنّت کے ان درجات کی وضاحت اگلی سورت یعنی سورۃ الواقعہ میں ملے گی (یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے)۔ سورۃ الواقعہ میں اہلِ جہنّم (اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ) کے مقابلے میں اہلِ جنّت کے دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں ایک گروہ تو اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ (دائیں جانب والوں) کا ہے۔ ان کے لیے الگ جنّت کا ذکر ہے جو نسبتاً نچلے درجے کی جنّت ہو گی۔ جبکہ دوسرا گروہ مقرّبینِ بارگاہ کا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہ تو بہت مقرّب ہوں گے‘‘۔ یہ وہی خوش نصیب لوگ ہیں جن کا ذکر سورۃ التوبہ میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِیۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ وَاَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ تَحۡتَهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۰۰﴾﴾

’’اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے‘ اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکوکاری کے ساتھ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے‘ اور اُس نے ان کے لیے وہ باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی‘ ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔‘‘

سورۃ الواقعہ میں ان مقربین بارگاہ کے لیے بہت خصوصی انداز میں جنّت کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے لیے بہت اونچے درجے کی جنّت ہو گی۔ چنانچہ میری رائے میں سورۃ الرحمٰن کی آیت ۴۶ میں جن دو جنّتوں (جِنّوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ) کا ذکر ہوا ہے وہ اصحاب الیمین کے لیے ہیں‘ جبکہ زیر مطالعہ آیات میں جِنّوں اور انسانوں میں سے مقرّبینِ بارگاہ کی جنّتوں کا ذکر ہونے جا رہا ہے۔

آیت ۶۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۶۴ ﴿مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾﴾ ’’دونوں گہرے سبز رنگ کی ہوں گی۔‘‘

ان دونوں جنّتوں کا رنگ سیاہی مائل سبز ہوگا۔ یعنی بہت گھنی اور سرسبز و شاداب۔ اس رنگ کے ذکر کی توجیہہ آگے آیت ۶۸ کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔

آیت ۶۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۶۶ ﴿فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾﴾ ’’ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے۔‘‘

یعنی ہر جنّت میں ایک ایک ایسا چشمہ ہوگا۔

آیت ۶۷ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۶۸ ﴿فِیْهِمَا فَاکِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾﴾ ’’ان دونوں میں میوے، کھجور اور انار ہوں گے۔‘‘

ان جنّتوں کی کیفیت کے بیان میں ایک طرف گویا عجمی پسند کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف عربی ذوق کی عکاسی۔ عجمی علاقوں کے درختوں اور باغات کے جوبن کا کمال یہ ہے کہ ان کے سبز پتّوں کا رنگ گہرا ہوتے ہوتے سیاہی مائل ہو جائے۔ ایسے درختوں اور پودوں کا سایہ بھی مثالی ہوتا ہے اور ان کے پھلوں کی پیداوار اور کوالٹی بھی بہترین ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمینِ عرب خصوصاً نزولِ قرآن کے علاقے حجاز کے ذوق کے مطابق ایک مثالی باغ کا نقشہ بھی دکھایا گیا ہے۔ یعنی پہاڑی ڈھلوان سے ابلتا ہوا چشمہ، چشمے کے نشیب میں کھجور اور انار کے درختوں کا جھنڈ اور ان درختوں کے جھرمٹ میں انگور کی لہلہاتی بیلیں!

آیت ۶۹ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۰ ﴿فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾﴾ ’’ان میں ہوں گی نہایت نیک سیرت اور خوبصورت عورتیں۔‘‘

آیت ۷۱ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۲ ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾﴾ ’’یعنی حوریں، جو قیام پذیر ہوں گی خیموں میں۔‘‘

یہاں پر ’’خیموں‘‘ کا ذکر خصوصی طور پر عرب کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب میں شہروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور زیادہ تر لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ اس لیے یہاں پر گھر یا محل کے بجائے خیمے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ﴿مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ﴾ کے الفاظ میں ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (الاحزاب:۳۳) کے حکم کی عملی جھلک دکھائی دیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل عورت کا وہ روپ ہے جس روپ میں اسلام اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام عورت کو ’’چراغِ خانہ‘‘ بن کر رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسے ’’شمعِ محفل‘‘ بننے سے منع کرتا ہے۔

یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ ان آیات میں جن دو جنّتوں کا ذکر ہو رہا ہے ان میں ’’حوریں‘‘ ہوں گی جبکہ قبل ازیں جن جنّتوں کا ذکر ہوا تھا ان میں حوروں کا نہیں بلکہ ’’جنّتی عورتوں‘‘ کا تذکرہ تھا: ﴿فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ ’’ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی‘‘۔ اسی طرح سورۃ الواقعہ میں اصحابُ الیمین کی جنّت میں خوبصورت عورتوں ﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾﴾ کا ذکر ہے جبکہ ’’مقربین‘‘ کے لیے جنّت کے حوالے سے ’’حُوْرٌ عِیْن‘‘ (آیت ۲۲) کا تذکرہ ہے۔

آیت ۷۳ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۴ ﴿لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾﴾ ’’نہیں چھوا ہوگا ان سے پہلے انہیں نہ کسی انسان نے اور نہ کسی جن نے۔‘‘

یہاں خصوصی طور پر جن اور انسان کے ذکر سے بھی میری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ یہ جنّوں اور انسانوں کے لیے الگ الگ جنّتوں کا بیان ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جنّوں کی جنّت کی حوروں کو ان کے خاوندوں سے پہلے کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا اور انسانوں کی جنّت کی حوروں کو قبل ازاں کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔

آیت ۷۵ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۷۵﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۶ ﴿مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ ۷۶﴾ ’’وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسندوں اور بہت نفیس بچھونوں پر۔‘‘

آیت ۷۷ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۷۷﴾ ’’تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟‘‘

آیت ۷۸ ﴿تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ۷۸﴾ ’’بہت بابرکت نام ہے تیرے ربّ کا جو بہت عظمت والا‘ بہت اکرام والا ہے۔‘‘ ❁❁❁

بقیہ: عرضِ احوال

آخر میں ہم یہ اعلان کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے کہ جب تک مسلمان مسبّب الاسباب پر مکمل اور اٹل بھروسہ نہیں رکھیں گے اور جب تک اُسی کے حکم کے مطابق اپنے گھوڑے تیار نہیں رکھیں گے تا کہ اللہ اور رسول ﷺ کے دشمنوں کو دندان شکن جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں‘ اُس وقت تک (معاذ اللہ) رسول کریم ﷺ کا استہزا بھی ہوتا رہے گا۔ کسی کو آپ ﷺ کے خاکے بنانے سے بھی نہیں روکا جا سکے گا اور دنیا بھر میں مسلمان خاندان ٹرک تلے بھی کچلے جاتے رہیں گے۔ مساجد میں بھی انھیں گولیوں سے بھونا جاتا رہے گا۔ قرآن پاک بھی نذرِ آتش ہوتا رہے گا۔ ہر عافیہ صدیقی کو دشمن اپنے ملک میں اُٹھا لے جائے گا اور اُسے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دے گا۔ کشمیر اور فلسطین میں مسلمان کیڑوں مکوڑوں کی طرح مارے بھی جاتے رہیں گے۔ مغرب کی فحش اور بے حیا تہذیب بھی ہم پر مسلّط رہے گی۔ لہٰذا بچاؤ اور دشمن کے ان اوچھے ہتھکنڈوں کا منہ توڑ جواب دینے کی ایک ہی صورت ہے‘ وہ یہ کہ جتنے اسباب ممکن ہوں پیدا کرو‘ لیکن اصل بھروسہ مسبّب الاسباب پر کرو! گویا میدان میں یوں کود جاؤ کہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہو۔ دل و دماغ جذبۂ شہادت سے لبریز ہوں اور زبان پر اللہ اکبر ہو۔ پھر ہمارا عیّار اور مکّار دشمن کسی صورت ہمارے سامنے ٹھہر نہیں پائے گا۔ ان شاء اللہ!

❁❁❁

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

محمد رشید عمر

سورۃ الاحزاب میں (غزوۂ احزاب کے موقع پر) مسلمانوں کے ساتھ شامل ایک کمزور طبقہ کے دلی خدشات اور طرزِ عمل کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ﴾

(آیت ۱۳)

''جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہلِ یثرب‘ تمہاری (کفّار کے لشکر کے مقابلہ میں) کوئی حیثیت نہیں‘ لہٰذا لوٹ جاؤ!''

فلسطین کے مسلمانوں پر یہودیوں کے ہاتھوں جو ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں ان کے جواب میں ایسے خیالات کا اظہار اس بیان میں ہے جو صدرِ پاکستان عارف علوی سے منسوب ہے: ''مسلم اُمّہ اسرائیل کے خلاف سخت اقدام اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتی‘ اس لیے ہمیں طاقتور کی آواز سننا پڑے گی۔''

غزوۂ احزاب کے موقع پر اسی طرح کے خیالات کا اظہار جن لوگوں نے کیا تھا‘ انہیں رسوا کن ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اِس وقت اُمّتِ مُسلمہ کی قیادت توہمات کا شکار اور بے بصیرت ہے۔ توہمات کا شکار اس لیے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طاقت پر یقین نہیں ہے‘ اُس کے احکامات اور وعدوں پر یقین نہیں ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یہود و نصاریٰ کے سامنے بے بس ہیں‘ ان سے بگاڑ کر ہم survive نہیں کر سکتے۔ بے بصیرت اس لیے کہ انہیں یہ نظر نہیں آ رہا کہ مستقبل اسلام کا ہے۔ عالمگیریت کی صلاحیت اسلام میں ہے‘ سیکولرازم میں نہیں۔

بات کو واضح کرنے کے لیے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مصر کی فرماں روائی ان کے مقدّر میں لکھ دی تھی۔ چنانچہ ان کے بھائیوں کی طرف

سے ان کو ایک اندھے کنوئیں میں پھینکنے کا دردناک سلوک پہلا قدم تھا۔ بازارِ مصر میں جانِ یوسفؑ کا چند کوڑیوں کے عوض فروخت ہونا اور عزیزِ مصر کی بیوی کی طرف سے انہیں بدکاری میں ملوث کر کے ذلیل کرنے کی کوشش ان کو منزل کی طرف اور قریب کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ قید خانہ کی قید وہ آخری رسوائی ثابت ہوئی جس کے بعد مصر کا اقتدار اللہ تعالیٰ نے ان کے حوالے کروا دیا۔ سورۂ یوسف اس سارے واقعے کی وضاحت پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بیانیہ ہے۔

دوسری بات: اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام کی کامیاب جِدّوجُہد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چُن لیا تھا۔ اس کامیابی کی طرف پہلا قدم ابولہب کا وہ ردِّعمل تھا جس کا اظہار اُس نے دعوتِ حق کے جواب میں ان الفاظ سے کیا تھا: تَبًّا لَکَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں‘ کیا محض اس لیے تُو نے ہمیں بلایا تھا۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کا تمسخر‘ اہلِ ایمان کی ایذا رسانی‘ شعب ابی طالب میں سوشل بائیکاٹ‘ سفر طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بے قدری اور بظاہر مکمل ناکامی‘ یہاں تک کہ مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت! کیا یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو منزل کے قریب نہیں کر رہا تھا؟ مدینہ میں پے بہ پے غزوات اور جنگوں کے بعد غزوۂ احزاب میں مشرکینِ مکّہ اور اُن کے حواریوں نے پوری طرح آپؐ کو اور اہلِ ایمان کو گھیرے میں لے لیا تھا تو یہ الفاظ بعض لوگوں کی زبان پر آ گئے تھے: ﴿يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ﴾ بلکہ اس سے بڑھ کر:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲﴾ (الاحزاب)

''جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ اللہ اور اُس کے رسول نے جو (فتح کے) وعدے ہم سے کیے تھے‘ وہ سب دھوکے کے سوا کچھ نہ تھا۔''

یہود و نصاریٰ کے ظالمانہ اقدامات کے سامنے اِس وقت مسلم اُمّہ کی قیادتیں انہی الفاظ کی تصویر بنی ہوئی ہیں‘ بلکہ جس طرح یہود مدینہ میں در پردہ مسلمانوں کے خلاف مشرکینِ مکّہ سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے‘ اسی طرح یہ قیادتیں بھی اسلام کے اصل اہداف کے خلاف انہی قوتوں سے عہد اور معاہدے کرنے میں مصروف ہیں‘ جبکہ یہودیوں کے انجام کے بارے میں ربّ ذوالجلال نے واضح فرما دیا ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝۱۰۴﴾ (الاسراء)

''پھر جب آخرت کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو جمع کر کے حاضر کر دیں گے۔''

فرمانِ نبویؐ کے مطابق سوائے غرقد کے درخت کے جس کی شجر کاری وہ بڑے اہتمام سے کر رہے ہیں' ہر درخت اور پتھر جس کے پیچھے یہودی چھپا ہوگا وہ پکار کر کہے گا کہ اے مسلمان! یہودی یہاں ہے' اسے ختم کردو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْيَهُوْدَ، فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ حَتّٰى يَخْتَبِئَ الْيَهُوْدِيُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ، فَيَقُوْلُ الْحَجَرُ اَوِ الشَّجَرُ: يَا مُسْلِمُ' يَا عَبْدَ اللّٰهِ' هٰذَا يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ، فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ، اِلَّا الْغَرْقَدَ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرِ الْيَهُوْدِ))

[صحيح مسلم' كتاب الفتن واشراط الساعة' باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل فيتمنى...]

''قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے لڑیں گے' پس مسلمان ان کو قتل کریں گے' یہاں تک کہ یہودی کسی پتھر یا درخت کی آڑ میں چھپے گا تو وہ پتھر یا درخت بولے گا: اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ میرے پیچھے ایک یہودی ہے' ادھر آ' اور اس کو قتل کر' مگر غرقد کا درخت نہ بولے گا' (یہ ایک کانٹے دار درخت ہے جو بیت المقدس کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے) کیونکہ وہ یہود کا درخت ہے۔''

تو کیا یہ قوم اپنے اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے فلسطین میں اکٹھی نہیں کر دی گئی؟ اپنے ظلم و زیادتی کی وجہ سے ہزاروں سال کی دربدری کی سزا بھگتنے کے بعد انہوں نے فلسطینیوں پر ظلم کی انتہا کی ہوئی ہے۔ تو جان لینا چاہیے کہ ان کے خاتمے کا آغاز ۱۹۱۷ء سے ہو چکا ہے' جب انہوں نے بالفور ڈیکلریشن کے ذریعے یہاں آباد ہونے کا اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا ہر قدم جو انہوں نے فلسطینیوں کے خلاف یا ہمسایہ اسلامی ملکوں کے خلاف اٹھایا ہے' بظاہر خواہ کامیابی نظر آئے' لیکن حقیقت میں وہ اپنے انجام کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ اس اعتبار سے مہربان اور شفیق ہے کہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کا راستہ دکھاتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹﴾ (الحدید)

''وہی (اللہ) تو ہے جو اپنے بندے پر کھلی کھلی آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔''

لیکن اس کے لیے وہ ہم سے مطالبہ کر رہا ہے:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۱۶﴾ (الحدید)

''کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھک جائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی' پھر ایک لمبی مدّت ان پر گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے۔ اور (آج) ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''

اُمّتِ مُسلمہ پر عروج کے بعد زوال کی صدیاں گزر رہی ہیں۔ غالب قوتوں نے ان کے قوائے عمل اور ایمان کو مضمحل کرنے کی مسلسل چالیں چل کر انہیں ایسے فسق و فجور میں غرق کر دیا ہے کہ واضح ہدایت اور وسائل ہونے کے باوجود سر اٹھا کر چلنے کی ہمت نہیں پاتے۔ قحط الرجال کا ایسا سامنا ہے کہ کوئی صورِ اسرافیل پھونکنے والی ہستی موجود نہیں ہے۔ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے؟

پہلی ضرورت اللہ تعالیٰ کی جناب میں سچی توبہ ہے۔ پھر اللہ کے نازل کردہ حقائق کو رہبر بنا کر مستقبل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر یہود و نصاریٰ کے ظلم و ستم اور جابرانہ توسیع پسندی کا شکوہ کرنے کا کوئی حق ہمیں حاصل نہیں' بلکہ ہم خود اُن کے منصوبوں میں اُن کے معاون بنے ہوئے ہیں۔

(۱) اسلام کو بطورِ نظامِ حیات نافذ کریں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے نظام کی پیروی خسارے سے دوچار کر دے گی۔

(۲) یہود و نصاریٰ سے دوستی قابلِ اعتبار نہیں۔ انہیں اور مشرکین کو دین اسلام کا نفاذ کسی صورت قبول نہیں ہوگا۔

(۳) کُفّار و مشرکین چاہے وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں' ان سے جنگ جاری رکھیں' یہاں تک کہ وہ اسلام کو بطورِ دین قبول کر لیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ضرورت ہوگی کہ:

(۱) ہر قسم کی جنگی صلاحیت حاصل کی جائے اور لوہے کی طاقت کو استعمال میں لایا جائے۔

(۲) معاشی خود انحصاری حاصل کی جائے۔

(۳) روایتی ذرائع آمدن کے علاوہ انسانی ضرورتوں کی ناگزیر چیزیں ایجاد کی جائیں تاکہ کثیر زرمبادلہ حاصل کیا جاسکے۔

(۴) معاشی قوت بننے کے لیے علاقائی وسعت حاصل کی جائے۔ افغانستان اور پاکستان کے علاوہ ہندوستان پر قبضہ کر کے ایک یونٹ بنایا جائے۔ ہندوستان سے جنگ اور اس پر قبضہ کرنے کی ٹھوس وجوہات (غزوۂ ہند) موجود ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ مشرکین ہی ہیں جو:

﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰﴾

(التوبة)

''یہ کسی بھی مومن کے معاملے میں کسی رشتہ داری یا معاہدے کا پاس نہیں کرتے۔ اور یہی ہیں زیادتی کرنے والے۔''

اگر یہ اسلام قبول نہیں کرتے تو جہاں ملیں ان کو قتل کر دیا جائے (غزوۂ ہند)۔

اس طرح ایک وسیع علاقہ اور بڑی آبادی کی مارکیٹ وجود میں آجائے گی' جس کی بنیاد پر یہود و نصاریٰ سے اپنی شرائط پر بات کی جاسکے گی۔ مسلمان حکمران اس بات کو سمجھ کر ان ذِمّہ داریوں کو پورا کریں تو بہتر ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اُس کے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ آخرت سے پہلے یہودیوں کا خاتمہ ہو کر رہے گا' خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا نظام قائم ہو کر رہے گا اور کوئی عیسائی ایسا نہ ہوگا جو موت سے پہلے ایمان نہ لے آئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کو پورا کر کے رہے گا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی!

صبر اور اعمال صالحہ پر قائم رہتے ہوئے' اگر مزاحمت کا راستہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں کو قوت میں بدل سکتا ہے' جو اسلام کے احیاء کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

❁❁❁

شہد کی مکھی

اللہ کی قدرت کی عظیم نشانی

ڈاکٹر محمد سرشار خان ☆

آپ نے کبھی کسی پھول پر منڈلاتی ہوئی شہد کی مکھی پر غور کیا ہے؟ یہ ننھی سی مخلوق قدرت کا ایک عظیم شاہکار ہے اور یہ واحد حشرہ یا کیڑا ہے جس کی بنائی ہوئی غذا انسانی خوراک کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ بے حد محنتی اور ذہین مخلوق اپنی ساری عمر (چھ سات ہفتے) میں ایک چمچ شہد کا محض دسواں حصّہ ہی بنا پاتی ہے۔ وہ شہد کی تلاش میں ایک اڑان کے دوران پچاس تا سو پھولوں کو دیکھتی ہے اور اس کام کے لیے اپنے چھتے سے آٹھ دس کلومیٹر دور تک جا سکتی ہے۔ آدھا کلو شہد بنانے کے لیے ان مکھیوں کو تقریباً ۲۰ لاکھ پھولوں کا رس اکٹھا کرنا پڑتا ہے، جس کے لیے بعض دفعہ انہیں مجموعی طور پر چودہ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ فاصلہ زمین کے گرد تقریباً تین چکر لگانے کے برابر ہے۔

حشرات کے اس خاندان میں کوئی بیس ہزار اقسام کی مکھیاں ہیں، لیکن ان میں شہد بنانے والی صرف سات اقسام ہیں۔ بمبل مکھی (Bumble Bee)، کارپینٹر مکھی (Carpenter Bee) اور کچھ دیگر اقسام پھولوں کا رس اکٹھا کرتی ہیں، مگر وہ شہد نہیں ہوتا۔ شہد کی مکھیاں سوائے شدید سرد علاقوں کے تقریباً تمام دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ تاہم جہاں موسم معتدل ہو اور پھولوں کی بہتات ہو، وہاں ان کی آبادی زیادہ ہوتی ہے۔

جسمانی بناوٹ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰﴾ (طٰہٰ)

☆ سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، ویٹرنری انسٹیٹیوٹ، لاہور

''(موسیٰ نے) کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو ساخت عطا کی، پھر اس کو راستہ بتایا۔''

یعنی کائنات کی ہر چیز کو اپنے حصّے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے جو بناوٹ درکار تھی، بالکل اسی طرح اسے تشکیل دیا۔ اس سے بہتر شکل یا ڈیزائن کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ربّ العالمین نے مخلوقات کی محض شکل ہی نہیں بنائی بلکہ ہر چیز کو اُس کے کام کے متعلق مکمل رہنمائی بھی دی۔ اس آیت مبارکہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم شہد کی مکھی کی جسمانی بناوٹ پر غور کرتے ہیں۔

دیگر کیڑوں (insects) کی طرح شہد کی مکھی کا جسم بھی سر، سینہ اور پیٹ کے واضح حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگوں کے بھی تین جوڑے ہوتے ہیں اور ہر ٹانگ میں چار جوڑ ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کے پاؤں کے آخر میں پنجے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ درختوں اور پتھروں کی کھردری سطح پر بھی بغیر گرے چل لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاؤں میں نرم پیڈ بھی بنے ہوتے ہیں، جن کی مدد سے وہ پھولوں، پتوں اور دیگر چکنی سطحوں پر بغیر پھسلے آسانی سے چل لیتی ہے۔

ٹانگوں کے اگلے جوڑے میں آخری جوڑ پر ایک کانٹا یا ہُک سا بنا ہوتا ہے۔ جب اس کے سر پر لگے ہوئے مونچھ نما محا سے (antennae) جن میں سونگھنے، چکھنے، سننے وغیرہ کی حس ہوتی ہے، پر بہت زیادہ زرِگل (pollen) لگ جاتا ہے تو مکھی انہیں اپنی ٹانگ کے اس جوڑ اور ہک کے درمیان پھنسا کر کھینچتی ہے۔ یوں سارا پولن اتر جاتا ہے۔ زرِگل دراصل باریک پیلے رنگ کے وہ ذرات ہوتے ہیں جو پھولوں کے نر حصے میں پیدا ہوتے ہیں۔

پولن کی ٹوکریاں

شہد کی مکھی پھولوں سے پولن اور رس (nector) حاصل کرتی ہے، جو شہد بنانے کے کام آتا ہے۔ پولن میں شہد ملا کر وہ خوراک تیار کرتی ہے جسے Bee Bread کہتے ہیں۔ بچے اور بڑے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ پولن میں پروٹین، روغنیات اور دیگر غذائی اجزاء وافر مقدار میں ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کا پورا جسم کانٹوں یا بالوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رس اور پولن اکٹھا کرنے کے عمل میں اس کا پورا جسم پولن سے لتھڑ جاتا ہے۔ جب یہ ایک پھول سے اڑ کر اسی نسل کے دوسرے پھول پر بیٹھتی ہے تو یہ پولن اس پھول کے مادہ حصّے پر لگ جاتا ہے۔ اسے زیرگی یا زرپاشی (pollination) کا عمل کہتے ہیں، جس سے بیج اور پھل وغیرہ بنتے ہیں۔

مکھی جسم پر لگے پولن کو اپنی اگلی اور درمیانی ٹانگوں پر بنے کنگھی نما دندانوں کی مدد سے کھرچ

کر پچھلی ٹانگوں پر سخت بالوں سے بنی ایک شفاف ٹوکری میں پیک کر لیتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر مکھی کی پچھلی ٹانگوں پر بنی یہ ٹوکریاں بآسانی نظر آجاتی ہیں جو زرد رنگ کے پولن سے بھری ہوتی ہیں۔

مکھی کا سر

مکھی کے بڑے نمایاں سر پر محاسوں (antennae) کی ایک جوڑی ہوتی ہے۔ حرکت کرنے والے یہ اعضاء ۹۰ ڈگری زاویے پر مڑے ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے مکھی اردگرد کی چیزوں کو لمس کے ذریعے محسوس کر سکتی ہے۔ پھولوں کو سونگھنے اور ان کے ذائقہ کا اندازہ بھی انہی سے لگاتی ہے۔ مکھی کے جبڑے مضبوط پٹھوں کی مدد سے جڑے ہوتے ہیں جو چھتے پر حملہ آور کیڑے مکوڑوں کے خلاف ایک مضبوط ہتھیار کا کام کرتے ہیں۔ چھتا بنانے کے لیے موم کو چبا کر نرم کرنے اور اسے ہشت پہلو شکل دینے کے لیے بھی وہ انہی جبڑوں کا استعمال کرتی ہے۔

مکھی کے مُنہ میں سونڈ کی طرح کی زبان ہوتی ہے جسے وہ لپیٹ کر رکھتی ہے۔ پھولوں کا رس چوسنے کے لیے وہ اسے سیدھا کر لیتی ہے۔ اسی سے پانی بھر کر گرمیوں میں چھتے کو ٹھنڈا رکھتی ہے کہ کہیں زیادہ حدّت سے موم کا چھتا پگھل نہ جائے۔ مکھی کے پَروں کے دو جوڑے ہوتے ہیں۔ پچھلے پَر اگلے پَروں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اڑتے وقت دونوں اطراف کے پَر درمیان میں بنی ہکوں کے ذریعے جڑ جاتے ہیں اور اکٹھے حرکت کرتے ہیں۔ مکھی ایک سیکنڈ میں اپنے پَروں کو تقریباً ۱۹۰ دفعہ حرکت دیتی ہے۔

مکھی کا ڈنک

یہ اپنی قسم کا مخصوص ڈنک ہے جو صرف ایک ہی دفعہ کام آتا ہے۔ مکھی کے پیٹ کے آخری سرے پر موجود اس ڈنک میں ایک ہک سا بنا ہوتا ہے جو دشمن کے جسم میں داخل ہو کر پھنس جاتا ہے۔ جب مکھی ڈنک چبھو کر اڑنے کی کوشش کرتی ہے تو ڈنک باہر نہیں نکل پاتا بلکہ اس کے ساتھ مکھی کے پیٹ کا آخری حصّہ بھی وہیں رہ جاتا ہے اور انتڑیاں باہر نکل آنے کی وجہ سے وہ فوراً مر جاتی ہے۔ نر مکھیاں ڈنک مارنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، جبکہ ملکہ مکھی کے ڈنک میں ہک نہیں ہوتا، لہٰذا وہ کئی بار ڈنک مار سکتی ہے۔

ڈنک کے ساتھ مکھی کی موت میں ایک حکمت بھی پوشیدہ ہے۔ اگر مکھی اپنا ڈنک بار بار استعمال کرتی تو اس عمل میں دیگر جانداروں اور انسانوں کے جراثیم ایک دوسرے میں منتقل ہو کے

بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے۔ نیز یہ جراثیم شہد میں بھی شامل ہو جاتے جو انسانوں کے لیے شفا بخش ہونے کی بجائے الٹا نقصان دہ ثابت ہوتا۔

مکھی کی آنکھیں

شہد کی مکھی کے سر کی اطراف میں دو بڑی بڑی مرکب (compound) آنکھیں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے سر کے اوپر بھی تین سیاہ دھبے نظر آتے ہیں جو دراصل تین آنکھیں ہیں۔ یہ تین آنکھیں روشنی میں ہونے والے معمولی سے بدلاؤ کو بھی فوری محسوس کر لیتی ہیں۔ مکھی ایک سیکنڈ کے ۳۰۰ ویں حصے میں بھی ہونے والی حرکت کو محسوس کر کے اپنا دفاع کر لیتی ہے۔ یہ تین آنکھیں روشنی کے لیے تو بہت حساس ہیں لیکن اشکال یا اشیاء کو نہیں پہچانتیں۔ یہ کام سر کے دونوں طرف موجود آنکھیں سرانجام دیتی ہیں۔ ان کے اندر بھی بال اُگے ہوتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان بالوں سے وہ ہوا کے رخ کا اندازہ لگا لیتی ہے اور تیز ہواؤں میں بھی اپنا سفر صحیح سمت میں بخوبی جاری رکھتی ہے۔

سر کے اوپر والی آنکھیں سورج کی مدد سے راستوں کے تعین میں مددگار ثابت ہوتی ہیں، حتیٰ کہ ابر آلود موسم میں بھی یہ سورج کو بالواسطہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مکھی بالائے بنفشی شعاعوں (Ultra Violet Rays) کو بھی بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ پھول ایسی شعاعیں بہت زیادہ منعکس کرتے ہیں (اسی لیے وہ شوخ رنگ اور دیدہ زیب نظر آتے ہیں)۔ شہد کی مکھی اس صلاحیت کی بنا پر پھولوں کو جلد ڈھونڈ نکالتی ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ مکھی کو نیلے، بنفشی اور ارغوانی یا بینگنی (purple) رنگ زیادہ پسند ہیں۔ وہ پھول جن میں ایک سے زیادہ رنگ اور ڈیزائن ہوتے ہیں، مکھیوں کو اپنی جانب جلد متوجّہ کر لیتے ہیں۔

ایک غلط فہمی

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شہد کی مکھی پھولوں کا رس اپنے پیٹ (معدے) میں اکٹھا کرتی ہے اور چھتے میں آ کر قے کر کے باہر نکال دیتی ہے۔ گویا شہد مکھیوں کی قے کا نام ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ دراصل معدے کے اوپر کی طرف ایک تھیلی سی بنی ہوتی ہے جسے شہد والا معدہ (Honey Stomach) کہتے ہیں۔ یہاں وہ پھولوں کا رس جمع کرتی ہے جو اس معدے سے نکلنے والی مخصوص رطوبتوں سے شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس معدے اور اصل معدے میں ایک

والو ہوتا ہے جو اس دوران بندر رہتا ہے۔ چھتّے میں آ کر وہ اس شہد کو چھتّے کے خانے میں انڈیل دیتی ہے۔ یوں اصل معدہ جس کا ہاضمے اور مکھی کی خوراک سے تعلق ہوتا ہے' بالکل علیحدہ ہوتا ہے۔ یوں بھی مکھی کی غذا صرف پولن بریڈ' شہد یا کبھی کبھار کوئی اور میٹھی چیز ہوتی ہے۔ وہ کبھی گندگی پر نہیں بیٹھتی اور نہ ہی گندی چیزیں کھاتی ہے۔

ملکہ مکھی

شہد کی مکھی کا شمار مل جل کر رہنے اور تنظیمی صلاحیت رکھنے والے جانداروں میں ہوتا ہے۔ شہد کے ایک چھتّے یا گھر میں بیس ہزار سے ساٹھ ہزار تک ''اہل خانہ'' ہو سکتے ہیں۔ ایک ملکہ کی سربراہی میں یہ بے حد منظّم طریقے سے زندگی گزارتے ہیں۔ مکھیوں کی زیادہ تعداد کارکن مکھیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو تمام کی تمام مادہ ہوتی ہیں۔ نر مکھیوں کی تعداد محض چند سو تک محدود ہوتی ہے۔ انہیں ''نکھٹو'' بھی کہا جاتا ہے۔ چھتا بنانے یا شہد اکٹھا کرنے میں نر مکھیوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ سوائے افزائشِ نسل (reproduction) کے یہ کوئی کام نہیں کرتیں۔

شہد کی مکھی کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾﴾ (النحل)

''اور تمہارے ربّ نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ اپنے گھر بنا پہاڑوں میں اور درختوں میں اور لوگ (انگوروں کی بیلوں کے لیے) جو چھتریاں بناتے ہیں ان میں' پھر ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے ربّ کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ نکلتی ہے اِن کے پیٹوں سے پینے کی ایک شے (شہد)' جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں' اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ یقیناً اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہاں شہد کی مکھی کو دی گئی ہدایات کے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے' جبکہ نحل اگر عام بول چال میں استعمال ہو تو مذکر ہوتا ہے۔ یہ بات تو حال ہی میں دریافت ہوئی ہے کہ چھتّا بنانے اور شہد تیار کرنے کا تمام تر کام مادہ مکھیاں سرانجام دیتی ہیں۔

قرآن حکیم نے یہ بات ساڑھے چودہ سو سال پہلے ہی واضح کر دی تھی۔ کیا یہ بھی قرآن حکیم کے الہامی کتاب ہونے کا ایک ثبوت نہیں ہے؟

ملکہ مکھی صحیح معنوں میں ملکہ اور پورے چھتے کی مطلق العنان حکمران ہوتی ہے۔ اس کے بغیر شہد کے چھتّے کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی زندگی بڑی پیچیدہ اور دلچسپ ہوتی ہے۔

ملکہ مکھی کی پیدائش

جب کارکن اور دایہ مکھیاں یہ سمجھتی ہیں کہ موجودہ ملکہ بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہے' انڈوں کی پیداوار میں کمی اور چھتّے کا نظم و نسق چلانے میں سستی کا مظاہرہ کیا جانے لگا ہے تو وہ چھتّے کے لیے نئی ملکہ کے انتخاب کے لیے متحرک ہو جاتی ہیں۔

ملکہ مکھی کسی بھی انڈے سے نکلنے والے عام لاروا (larvae) کی طرح اپنی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ زندگی کے ابتدائی تین دنوں میں انڈوں سے نکلنے والے تمام لاروا کو ایک خاص خوراک شاہی جیلی (Royal Jelly) دی جاتی ہے۔ یہ خوراک انڈوں' بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرنے والی مکھیاں اپنے سروں پر موجود خاص غدودوں کی مدد سے تیار کرتی ہیں۔ تین دن بعد باقی لاروا کو عام خوراک پر منتقل کر دیا جاتا ہے' جبکہ ملکہ مکھی کی پرورش تمام عمر اسی شاہی جیلی سے کی جاتی ہے۔ اس میں موجود ایک خاص پروٹین (Royalactin) کی وجہ سے وہ دوسری مکھیوں کے برعکس ۲۱ دنوں کی بجائے ۱۶ دن ہی میں مکمل مکھی بن کر اپنے خانے سے باہر آ جاتی ہے۔ ملکہ مکھی دیگر مکھیوں کی نسبت بڑی جسامت کی ہوتی ہے۔ نر مکھیاں کارکن مادہ مکھیوں سے ذرا چھوٹے سائز کی ہوتی ہیں۔

دایہ مکھیاں حفظ ماتقدم کے طور پر تین' چار یا اس سے بھی زیادہ انڈوں کی پرورش ملکہ مکھی کے طور پر کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں اگر ایک ہی وقت میں دو ملکہ مکھیاں چھتے میں پیدا ہو جائیں تو ان کی آپس میں باقاعدہ جنگ ہوتی ہے اور جیتنے والی مکھی دوسری کو موت کے گھاٹ اتار کر تخت و تاج کی مالک بن جاتی ہے۔ ملکہ مکھی چھتے میں موجود دیگر زیر پرورش ملکہ مکھیوں کو بھی چن چن کر مار دیتی ہے تاکہ اس کا کوئی حریف نہ بچ سکے۔ اپنے ملک میں امن و امان اور اپنی حاکمیت کو مستحکم کرنے کے بعد ایک ہفتے کی عمر میں وہ عروسی پرواز (Nuptial Flight) کے لیے چھتے سے اڑان بھرتی ہے۔ دوران پرواز ہی پندرہ بیس نر مکھیاں (drones) اس سے ملاپ کرتی ہیں اور ہر ملاپ

کرنے والی نر مکھی اس عمل میں جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ تمام نروں کے مادہ منویہ کو ملکہ مکھی اپنے پیٹ میں بنی ایک تھیلی میں سٹور کر لیتی ہے' جو اُس کی تمام عمر کے انڈوں کی زرخیزی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ملکہ مکھی چھتے میں واپس آجاتی ہے۔ عموماً یہی اس کی پہلی اور آخری پرواز ہوتی ہے۔ چھتے میں واپس آنے والے ناکام عاشقوں یعنی نر مکھیوں کو چھتے کی مکھیاں خود ہی مار دیتی ہیں' کیونکہ اب ان کے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

جب چھتّا بہت بڑا ہو جائے اور اکیلی ملکہ کے لیے اس کا نظم ونسق چلانا مشکل ہو جائے تو ملکہ مکھی اپنے وفاداروں کی فوج کو لے کر چھتا چھوڑ کر فضا میں اڑنا شروع کر دیتی ہے۔ دیگر مکھیاں ملکہ مکھی کے جسم سے نکلنے والی خاص خوشبو یا مہک کی وجہ سے اس کے ساتھ ہی محوِ پرواز رہتی ہیں۔ اس دوران سکاؤٹ مکھیاں نئے چھتے کے لیے کسی موزوں جگہ کا انتخاب کر لیتی ہیں۔ ملکہ مکھی کو جگہ پسند آنے کی صورت میں کارکن مکھیاں وہاں نیا چھتّا بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ پرانے چھتے والی مکھیاں اپنے لیے ایک نئی ملکہ کا انتخاب کر لیتی ہیں۔

ملکہ مکھی شاہی پروٹوکول کے ساتھ زندگی گزارتی ہے' جو تین سے پانچ سال تک ہو سکتی ہے۔ ملکہ مکھی کے گرد دائرے کی شکل میں خادم مکھیوں یا درباری عملے کا گھیرا ہوتا ہے جو اس کی حفاظت و خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ ان تمام مکھیوں کے سر ملکہ مکھی کی طرف ہوتے ہیں۔ جب وہ چلتی ہے تو سامنے والی مکھیاں الٹے پاؤں پیچھے کو ہٹتی ہیں تاکہ حلقہ بھی نہ ٹوٹے اور حکم بجا لانے میں بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔ ملکہ مکھی ہر خانے کا معائنہ کر کے اس میں احتیاط سے ایک انڈہ دیتی ہے۔ اگر کوئی خانہ صاف نہ ہو تو اس میں انڈہ نہیں دیا جاتا۔ دایہ مکھیاں دوبارہ اس کی صفائی کرتی ہیں اور ملکہ مکھی اس خانے کا معائنہ کر کے اس میں انڈہ دیتی ہے۔ ملکہ مکھی روزانہ ایک ہزار سے دو ہزار تک انڈے دیتی ہے۔ اس کا انحصار خوراک کی موجودگی اور فراوانی پر ہوتا ہے۔ سردیوں میں جب پھول بہت کم تعداد میں کھلتے ہیں تو ملکہ مکھی انڈے دینا بند کر دیتی ہے تاکہ بچوں کو خوراک کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کارکن مکھیوں کو موسم سرما میں پھولوں کی کمی کی وجہ سے اتنا کام نہیں کرنا پڑتا' لہٰذا ان کی عمر چار سے چھ ماہ تک بھی ہو سکتی ہے' جبکہ موسم گرما اور بہار میں پیدا ہونے والی کارکن مکھیاں مسلسل کام کی وجہ سے صرف چھ ہفتوں تک ہی جی پاتی ہیں۔ نر کی عمر بھی چار ماہ تک ہوتی ہے۔ تاہم اگر خوراک کی کمی کا سامنا ہو تو ان میں سے اکثر کو مار دیا جاتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ملکہ مکھی کو اتنی محنت سے رائل جیلی بنا کر کھلانے والی مکھی خود یہ شاہی خوراک کیوں نہیں کھاتی! وہ ساری عمر مزدوروں کی خوراک (Honey Bread) پر ہی گزارہ کیوں کرتی ہے؟ کبھی کسی مکھی کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ میں ساری زندگی چھتا بنانے' ننھے لاروا کی دایہ گیری' ملکہ مکھی کی خدمت اور پھولوں سے رس اور پولن اکٹھا کرتے بھرپور مشقت میں گزار دیتی ہوں۔ کیوں نہ میں اس چھتّے کو خیرباد کہہ دوں۔ دن کو سو پچاس پھولوں کی سیر کر کے پیٹ بھر لیا اور رات کسی درخت کی کھوہ یا زمین کی دراڑ میں گزار لی۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی کے دل میں اپنی بات ڈال دیتا ہے تو پھر اُس کے دماغ میں کوئی اور بات' کوئی اور سوچ داخل ہو ہی نہیں سکتی۔ مکھی کی جبلت میں یہ چیز رکھ دی گئی ہے' یہ اُس کا فطری وصف بنا دیا گیا ہے۔ جبلت کہتے ہی اس قوت کو ہیں جس پر عمل کرنے سے کچھ نتائج تو پیدا ہوں مگر اس عمل کی پہلے کوئی تعلیم نہ ہوئی ہو۔ مکھی نے چھتا بنانے اور پھولوں کی تلاش اور راستوں کا علم تجربے اور تعلیم سے حاصل نہیں کیا' بلکہ اُسے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے' جیسا کہ متذکرہ بالا آیت قرآنی سے واضح ہے۔

شہد کی مکھی کا چھتّا

ہر مکھی کے پیٹ کے نچلے حصّے میں موم پیدا کرنے والے غدودوں کے آٹھ جوڑے ہوتے ہیں۔ ان سے وہ موم کے ننھے قطرے خارج کرتی ہے جو ہوا لگنے سے سخت ہو جاتے ہیں۔ یہ مکھیاں اپنے جبڑوں سے انہیں نرم کر کے چھتے کے شش پہلو خانے (Hexagonal cells) بناتی ہیں۔ شہد کی مکھی اکٹھی کی گئی موم میں گول گول گھومتی ہے اور اپنی جسمانی حرارت سے اسے نرم کر کے پہلے ایک گول خانے کی شکل دیتی ہے' جسے باقی مکھیاں مل کر چھ اطراف والے خانے میں بدل دیتی ہیں۔ حیرت انگیز طور پر ہر ایک خانے کے تمام اضلاع کی لمبائی اور زاویے بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ ان خانوں میں نئی مکھیوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ پولن اور شہد بھی انہی خانوں میں جمع کیا جاتا ہے۔

شش پہلو خانے ہی کیوں؟

چھتے میں صرف چھ اطراف والے خانے ہی ملیں گے۔ گول یا کسی اور شکل کے خانے مکھی کبھی نہیں بناتی۔ جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ سب سے مفید یعنی کم میٹریل' کم محنت اور کم جگہ کے ساتھ مضبوط ترین ڈیزائن یہی ہے۔ مثلاً اگر وہ گول خانے بنائے تو چھتے میں خالی جگہیں زیادہ

بن جائیں گی جنہیں بھرنے کے لیے زیادہ موم کی ضرورت پڑے گی۔ ایک مشہور سائنس دان کوبے (Cobey) بیان کرتا ہے کہ شش پہلو ڈیزائن ہی کم سے کم مواد کے استعمال سے زیادہ سے زیادہ وزن سہار سکتا ہے۔ بعض چھتوں میں ۴۰ کلو سے ۱۳۰ کلو تک بھی شہد ہو سکتا ہے۔ اتنے وزن کو برداشت کرنے کے لیے چھتے کی مضبوطی بہت ضروری ہے۔ سائنس کی زبان میں اس ڈیزائن کو Honey Comb Shape کہا جاتا ہے اور اسے پلوں، ہوائی جہازوں، راکٹوں اور کاروں وغیرہ کی باڈی کو ہلکا مگر مضبوط تر بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کارکن مکھیاں

ایک ملکہ اور چند سو نر مکھیوں کے علاوہ چھتے کی تمام تر آبادی کارکن مادہ مکھیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ شہد کی مکھی کی مختصر زندگی بھی تین مراحل پر مشتمل ہوتی ہے۔ پیدائش کے بعد یہ تین سے بارہ دن تک چھتے کی دیکھ بھال، صفائی، انڈوں بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا کام کرتی ہیں۔ ان کے فرائض میں مُردہ مکھیوں اور مُردہ لاروا کو چھتے سے باہر پھینکنا بھی شامل ہے۔ کچھ مکھیاں پانی لا کر چھتے میں جمع کرتی ہیں اور پھر پروں سے ہوا دے کر چھتے کا درجہ حرارت کم کرنے کا کام کرتی ہیں۔ انڈوں سے بچے نکلنے کے لیے چھتے کے متعلقہ خانوں کا درجہ حرارت 34.4 درجے سنٹی گریڈ ہونا چاہیے۔ سردی کی صورت میں بہت سی مکھیاں ان خانوں کے اوپر اکٹھی ہو جاتی ہیں تاکہ ان کے جسموں کی گرمی سے مطلوبہ درجہ حرارت برقرار رہے۔ چھتے میں شہد اور پولن کو جمع کرنے کا کام بھی یہی مکھیاں کرتی ہیں۔ مکھیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یونہی پڑا رہنے سے پولن خراب ہو جائے گا، اس لیے وہ اس میں تھوڑا سا شہد ملا کر خانے میں اچھی طرح پیک کر کے seal کر دیتی ہیں۔ ملکہ کی دیکھ بھال اور حفاظت کا کام بھی انہی کے سپرد ہے۔ تیرہ چودہ دن کی عمر میں یہی مکھیاں چھتے کے لیے نئے خانے بنانا شروع کر دیتی ہیں اور ساتھ پرانے خانوں کی مرمت بھی کرتی ہیں۔ ۱۷ سے ۲۲ دن کے بعد یہ رس اور پولن اکٹھا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ کام ساری زندگی جاری رہتا ہے۔

فیرومونز (Pheromones)

ملکہ مکھی کے جسم سے خارج ہونے والی ایک مخصوص مہک چھتے کی مکھیوں کو ایک با اختیار حکمران کی موجودگی کا احساس دلائے رکھتی ہے۔ صرف یہی مہک نہیں، ملکہ مکھی کے پیٹ پر موجود پندرہ غدودوں سے مختلف اقسام کی خوشبوئیں حسب ضرورت مطلوبہ مقدار میں خارج ہوتی

رہتی ہیں، جن کی مدد سے وہ کسی دوسری ملکہ مکھی کی پیدائش کو روکنے اور اپنے دیگر احکامات پر عمل درآمد کا کام لیتی ہے۔ چھتے کی تعمیر، صفائی، پولن و شہد کی سپلائی اور سٹوریج، انڈوں بچوں کی پرورش و حفاظت اور دشمن سے بچاؤ کے احکامات انہی خوشبوؤں کے ذریعے دیگر مکھیوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ دیگر مکھیاں بھی آپس میں ایسی ہی خوشبوؤں سے رابطہ بنائے رکھتی ہیں۔ تاہم ملکہ مکھی کے پیدا کردہ ان طاقتور ''فرمانوں'' کو Queen's Signals کہا جاتا ہے۔ انہی کے ذریعے چھتے کی فضا کو متعلقہ احکامات پر عمل درآمد کے لیے ہموار کیا جاتا ہے۔ سائنس کی زبان میں ان خوشبوؤں کو فیرومونز کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہارمونز کی طرح جانداروں کے رویوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مرد و زن کے جسم سے خارج ہونے والی جنسی خوشبوئیں اور دیگر کئی جانداروں کے اجسام سے نکلنے والی ایسی خوشبوئیں فیرومونز کے زمرے میں آتی ہیں۔

باہمی رابطہ

فیرومونز کے علاوہ مکھیاں دیگر ذرائع سے بھی معلومات کا تبادلہ کرتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پھولوں کا رس چکھاتی ہیں۔ مکھی اپنا منہ کھول کر ایک قطرہ باہر نکالتی ہے جو دوسری اپنی سونڈ نما زبان سے چوس لیتی ہے۔ دو مکھیاں اپنے محاسے (antennae) بھی ایک دوسرے سے ملاتی ہیں، جس سے دوسری مکھی مخصوص پھولوں کی خوشبو محسوس کرتی ہے۔ ذائقے اور خوشبو سے یہ مکھی اس ذخیرے کو خود ہی ڈھونڈ نکالتی ہے۔

راستے کی تلاش

مکھیوں کے اندر ایک قدرتی GPS لگا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ کبھی بھی راستہ نہیں بھولتیں۔ کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ زمینی مقناطیسی میدان کو محسوس کر کے سمت کا اندازہ لگاتی ہیں۔ مکھیوں کو سورج کی حرکت اور مقام کا بالکل صحیح اندازہ ہوتا ہے اور سورج کی سمت میں ایک ڈگری کے فرق کو بھی محسوس کر کے اس کے مقام کا تعیّن کر لیتی ہیں۔

﴿ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾

''اور ہر طرح کے پھولوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہموار کی ہوئی ہر راہ راہی کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ وہی رہنمائی ہے جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں آتا ہے:

﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰﴾

''کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو ساخت عطا کی پھر اس کو راستہ دکھایا۔''

شہد کی مکھی navigation یا راستوں کی تلاش، چھتے یا پھولوں کے ذخیرے کی جگہ کا پتا چلانے کے لیے بہت ہی پیچیدہ حساب کتاب ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں کر لیتی ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں دس ٹریلین commutations یا حساب کر سکتی ہے جو کہ دنیا کے تیز ترین کمپیوٹر سے ۶۲۵ گنا تیز ہے۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے جب سورج چھپا ہوتا ہے اُس وقت بھی مکھیاں مدھم روشنی (Polarised light) سے سورج کے اصل مقام کا تعین کر لیتی ہیں۔ اس کے لیے جو طریقہ کار وہ اختیار کرتی ہیں وہ ایک بے حد پیچیدہ حسابی نظام ہے۔

مچھر یا عام گھریلو مکھی کے سر کی اطراف دو بڑی بڑی مرکب آنکھیں ہوتی ہیں، جبکہ شہد کی مکھی میں ان کے علاوہ بھی سر کے اوپر تین چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہوتی ہیں۔ یہ آنکھیں ابر آلود موسم میں آسمان سے آنے والی منتشر روشنی کو محسوس کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہیں۔ مکھی دماغ میں تجزیے کے بعد اس سے فاصلوں اور اڑان کی سمت کا درست اندازہ لگا لیتی ہے۔

مکھی اڑتے ہوئے بھی یہ حساب کتاب جاری رکھتی ہے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ ہر چار منٹ بعد سورج ایک ڈگری آگے چلا جاتا ہے۔ وہ بھی اسی حساب سے سورج اور چھتے یا ذخیرے کے درمیان بننے والے زاویے میں کمی بیشی کر کے صحیح مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں بھی متذکرہ بالا آیت قابلِ توجہ ہے کہ شہد کی مکھی اللہ کی ہموار کی ہوئی راہوں پر کیسے چلتی ہے۔

مکھیوں میں پیغام رسانی

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوقات میں غور و فکر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام اشیاء کے بارے میں انسان کا فطری تجسّس بھی حقیقت تک پہنچنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ سب سے پہلے ارسطو نے یہ مشاہدہ کیا کہ شہد کی مکھی جب چھتے میں داخل ہوتی ہے تو تین چار مکھیاں اُس کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہ مکھی اپنے جسم کو کچھ عجیب سی حرکات دیتی ہے جن کا تعلق غالباً خوراک سے ہوتا ہے۔ وہ اس طرح اپنی ساتھی مکھیوں کو خوراک کے ذخیرے کے بارے میں معلومات دیتی ہے۔ مگر کیسے دیتی ہے، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۹۴۴ء کے موسم گرما میں جرمن سائنسدان کارل (Carl VonFrich) نے پہلی بار

شہد کی مکھیوں کی زبان کو سمجھا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ اس دریافت پر اسے نوبل انعام دیا گیا۔ کارل نے اس علامتی زبان یا مکھیوں کے رقص کو بہت تفصیل کے ساتھ سمجھا۔ اُس نے بتایا کہ مکھی واپس چھتے میں آ کر ایک مخصوص جگہ (dancing floor) پر خاص حرکات یا رقص سے دوسری مکھیوں کو بتاتی ہے کہ مثلاً مَیں نے جو پھولوں کا ذخیرہ دریافت کیا ہے وہ یہاں سے ایک کلومیٹر پانچ سو میٹر دور ہے اور سورج کی موجودہ پوزیشن سے ۳۵ ڈگری پر واقع ہے۔ وہ اس ذخیرے میں موجود رس اور پولن کی مقدار کے بارے میں بھی آگاہ کرتی ہے کہ وہ ذخیرہ چھوٹا ہے یا بڑا۔ یہ معلومات اس حد تک درست ہوتی ہیں کہ دوسری مکھیاں بغیر کسی رہنما کے خود ہی متعلقہ مقام تک بآسانی پہنچ جاتی ہیں۔ اتنی بڑی دریافت کے ساتھ اُس نے اس بات کا بھی کھوج لگایا تھا کہ مکھی آسمان میں سورج کی بالکل صحیح پوزیشن کا اندازہ کس طرح لگا لیتی ہے، خصوصاً ان حالات میں جب آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہو۔ بعد میں دیگر محقّقین نے دریافت کیا کہ ابر آلود موسم میں کچھ اور کیڑے مثلاً جھینگر اور ٹڈے (locust) بھی سورج کی صحیح پوزیشن کا اندازہ لگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پیغام کی نوعیت کے حوالے سے مکھیوں کا رقص بھی مختلف طرح کا ہوتا ہے۔ رقص کی زبان کا یہ نظام دنیا میں کسی اور جاندار میں نہیں پایا جاتا۔ یہاں ہم چند بڑی اقسام کا ذکر کریں گے۔

گول دائرے کا رقص: یہ سب سے سادہ رقص ہے جس میں شہد کی مکھی ایک دائرے میں گھومتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پھولوں کا جو ذخیرہ دریافت کیا گیا ہے وہ چھتے کے بہت قریب ہے۔ پیغام رساں مکھی کچھ مکھیوں کو ان پھولوں کے رس کا ذائقہ بھی چکھا دیتی ہے اور وہ اس کے جسم سے ان پھولوں کی خوشبو بھی محسوس کر لیتی ہیں، جس کی مدد سے وہ بآسانی ان پھولوں کو ڈھونڈ نکالتی ہیں۔

لہریا رقص (Waggle Dance): یہ سب سے اہم رقص ہے جو اُس وقت کیا جاتا ہے جب دریافت شدہ ذخیرہ تین چار سو میٹر دور ہو۔ پھولوں کا ذخیرہ دریافت کرنے والی مکھی ڈانس فلور پر آ کر پہلے تو دوسری مکھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پھر وہ سورج کی پوزیشن کے حوالے سے چھتے میں ایک سیدھی لائن میں چلتی ہے اور اپنے جسم کو اوپر نیچے تیز تیز حرکت دیتے ہوئے پھولوں کے ذخیرے کی سمت کا سورج کی نسبت سے زاویہ بناتی ہے، جو اس ذخیرے کی صحیح سمت کی نشان دہی کرتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مکھی اپنے رقص کے زاویے میں ہر چار منٹ بعد ایک ڈگری اضافہ

کر لیتی ہے' کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ سورج کی حرکت کی وجہ سے بیان کردہ زاویے میں ایک ڈگری کا اضافہ ہو گیا ہے۔ دیگر مکھیوں کو مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں جتنا وقت لگتا ہے' وہ پہلے سے معلوم شدہ زاویے میں اسی تناسب سے ڈگری کا اضافہ کر لیتی ہیں۔ یہ حساب کتاب وہ ساتھ ساتھ ہی دوران پرواز کرتی جاتی ہیں۔

فرض کریں مکھی ایک مقام الف سے ب تک ذخیرے کی سمت میں سیدھا آگے کو جاتی ہے۔ مقام ب سے نصف دائرہ بناتی ہوئی واپس مقام الف پر آتی ہے۔ وہاں سے پھر سیدھا مقام ب تک جاتی ہے اور دوسری طرف نصف دائرہ بناتے ہوئے دوبارہ مقام الف تک آ جاتی ہے۔ گویا 8 کی شکل کا یہ ایک چکر مکمل ہو گیا۔ سیدھی لائن میں چلتے ہوئے وہ اپنے جسم کو تیز تیز تھرتھراتی بھی ہے اور پروں سے بھنبھناہٹ بھی پیدا کرتی ہے تاکہ دوسری مکھیاں متوجّہ ہو کر یہ رقص دیکھیں۔

8 کی شکل کے چکروں کی ایک مخصوص وقت میں کم یا زیادہ تعداد سے فاصلے کی معلومات دوسری مکھیوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر منزل مقصود ۱۰۰ میٹر دور ہے تو مکھی پندرہ سیکنڈ میں آٹھ کی شکل والے دس مختصر چکر تیزی سے لگائے گی' لیکن اگر فاصلہ تین کلومیٹر ہے تو اس عرصے میں وہ صرف تین لمبے لمبے چکر ہی لگائے گی۔ نئی مکھیاں رقص کو کئی بار دیکھ کر اس کی اوسط نکال لیتی ہیں جو بالکل درست ہوتی ہے۔

کانپنے یا لڑکھڑاہٹ کا رقص (Tremble Dance): اس رقص میں مکھی اپنے جسم کو آگے پیچھے ہلاتی ہے اور ساتھ ہی ہر سیکنڈ بعد اپنے جسم کو ۵۰ ڈگری زاویے پر گھماتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ چھتے میں آہستہ آہستہ چل بھی رہی ہوتی ہے۔

یہ ڈانس وہ اُس وقت کرتی ہے جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ جورس اور پولن وہ اتنی محنت اور تندہی سے اکٹھا کر کے لائی ہے اسے چھتے میں وصول کرنے اور سنبھالنے والی مکھیاں سستی سے کام لے رہی ہیں۔ اس رقص کے ذریعے وہ دوسری کارکن مکھیوں کو بتا دیتی ہے کہ فی الحال سپلائی کا کام روک دو۔ اس صورت حال میں مزید مکھیوں کو رس اور پولن سنبھالنے کے لیے ''بھرتی'' کر لیا جاتا ہے۔ یوں دوبارہ حالات معمول پر آ جاتے ہیں اور کوئی بدنظمی پیدا نہیں ہوتی۔

پیٹ کی لرزش کا ڈانس (Dorsoventral Vibration): یہ رقص بھی کارکن مکھیوں کی استعداد کار کو بہترین طریقے سے استعمال کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس میں ایک مکھی دوسری مکھی

کے اوپر سوار ہو جاتی ہے اور اس کے پیٹ کو اوپر نیچے ہلاتی ہے۔ یوں دوسری مکھی کو بتایا جاتا ہے کہ پھولوں کا کوئی نیا ذخیرہ مل گیا ہے اور اسے اکٹھا کرنے کے لیے زیادہ مکھیوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قسم کے جسمانی اشارے یا رقص ہیں۔ مثلاً 8 کی شکل میں سادہ ڈانس یہ ظاہر کرتا ہے کہ ذخیرہ قریب ہی ہے مگر زیادہ قریب بھی نہیں۔ اس کے علاوہ مکھیاں دوسری مکھیوں کو کہنی مار کر بھی لہریا رقص کی طرف متوجّہ کرتی ہیں۔

مکھیوں کا شمار مل جل کر رہنے اور مکمل تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ معاشرتی زندگی گزارنے والے جانداروں میں ہوتا ہے اور وہ صورتحال کے مطابق امداد باہمی کے اصولوں پر جمہوری رویوں کے ساتھ بہترین فیصلے کرتی ہیں۔ جہاں تک پھولوں اور رس اکٹھا کرنے والی مکھیوں کا تعلق ہے' ہر مکھی کو اپنے ذخیرے کے متعلق پوری معلومات ہوتی ہیں۔ اگر وہ ذخیرہ ناقص ہے تو وہ اُسے خود ہی چھوڑ دے گی اور دوسری مکھی کے لہریے رقص کو دیکھے گی اور اس کا دریافت شدہ ذخیرہ بہتر ہونے کی صورت میں اُدھر کا رخ کر لے گی۔ لہٰذا ہر مکھی لاگت و نفع کا تجزیہ (Cost and Benefit Analysis) خود ہی کرتی ہے۔ چونکہ مکھیاں اُدھر ہی جاتی ہیں جدھر جانا چھتے کے لیے زیادہ نفع بخش ہو' اس لیے پورے چھتے میں سپلائی کا نظام مناسب ترین طریقے سے جاری رہتا ہے۔ اس عمل میں ذخیرے کے چھتے سے فاصلے' موسمی حالات' ہوا کے رخ' چھتے کی موجودہ غذائی ضروریات اور اس میں پہلے سے جمع شدہ غذا کی صورت حال کو بھی مدِنظر رکھا جاتا ہے۔

شہد: انسانوں کے لیے شفا

شہد زمانہ قدیم ہی سے غذا سے زیادہ دوا کے طور پر استعمال ہوتا آ رہا ہے۔ جراثیم کش اور دافع جراثیم اثرات کی وجہ سے یہ نہ صرف اندرونی اور بیرونی زخموں کے علاج کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ اس خاصیت کی وجہ سے جلد خراب بھی نہیں ہوتا۔ ایک مصری اہرام سے دو ہزار سال پرانا شہد سے بھرا برتن برآمد ہوا جو ذائقے میں ابھی تک مزیدار تھا۔ شہد میں تو اگر کوئی اور چیز بھی ڈال دی جائے تو وہ بھی خراب نہیں ہوتی۔ شہد میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اتنی شفا رکھی ہے کہ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

شہد جلد کی خوب صورتی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ملکہ قلوپطرہ کے میک اپ کے سامان کا یہ ایک لازمی جزو تھا۔

شہد میں پھلوں کی قدرتی شکر فرکٹوز، مالٹوز اور گلوکوز کی وجہ سے یہ جسم میں جاتے ہی طاقت و توانائی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔اس لیے شوگر کے مریض بھی بلا جھجک اسے مٹھاس کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔اس میں انزائمز، وٹامنز، منرلز اور اینٹی آکسیڈنٹس ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کی واحد خوراک ہے جس میں Pinocembrin نامی اینٹی آکسیڈنٹ ہوتا ہے جو دماغی کارکردگی بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔

وہ امراض جن کے علاج میں شہد کا استعمال ہورہا ہے، یہ ہیں: حافظے کی کمزوری، پرانے زخم اور السر، جلنے سے ہونے والے زخم، کینسر، بواسیر، چنبل اور دیگر جلدی بیماریاں، الرجی، بانجھ پن۔ان کے علاوہ اسے بے شمار دیگر ادویات کے ساتھ ملا کر مختلف امراض میں استعمال کیا جاتا ہے۔ روزانہ شہد کا ایک چمچ آپ کو بے شمار بیماریوں سے بچا سکتا ہے۔

زیرگی یا زرپاشی (Pollination)

ابھی تک شہد کی مکھی کا صرف شہد کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ہماری خوراک کا ایک تہائی حصّہ بشمول پھل اور سبزیاں انہی مکھیوں کا مرہونِ منّت ہے۔اگر خوراک میں سے گندم، چاول اور مکئی نکال دیے جائیں تو یہ تناسب دو تہائی تک پہنچ جاتا ہے۔اگر شہد کی مکھیاں وغیرہ نہ ہوں تو نہ سبزیاں اُگیں گی اور نہ پھل دار پودوں کو پھل لگے گا۔ دوسری صورت میں اگر پھول نہیں ہوں گے تو مکھیاں بھی نہیں رہیں گی۔

جس طرح جانوروں میں نر اور مادہ کے ملاپ سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور نسل آگے چلتی ہے اسی طرح پودوں میں بھی نر اور مادہ کے ملاپ سے بیج بنتے ہیں جن سے نئے پودے جنم لیتے ہیں۔ جانور چونکہ حرکت کرسکتے ہیں اس لیے نر مادہ تک پہنچ کر اپنا تولیدی مواد اس کے جسم میں داخل کردیتے ہیں۔ پودوں میں ایسے نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ زمین میں ایک جگہ پر مستقل اُگے ہوتے ہیں۔قدرت نے پودوں میں نر کے تولیدی مواد یعنی پولن کو مادہ حصے یا بیضہ دانی (Ovary) تک پہنچانے کے لیے دیگر انتظامات کر رکھے ہیں۔اس کام کے لیے شہد کی مکھیوں، چند دیگر حشرات، پرندوں اور ہوا، جبکہ پانی میں اُگنے والے پودوں کے لیے پانی کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ پودوں میں افزائش نسل کے اس طریقے کو pollination کہا جاتا ہے، جس میں پولن کسی تیسرے عامل کی مدد سے مادہ تک پہنچایا جاتا ہے۔

پھول کی پنکھڑیوں کے وسط میں دو قسم کی ساختیں ہوتی ہیں۔ ان میں ایک طرح کی ساخت میں پھول کا نر حصّہ ہوتا ہے جو لمبی باریک ڈنڈیوں کے اوپر چھوٹی سی تھیلیوں (anthers) پر مشتمل ہوتا ہے۔اس میں زرِگل یعنی پھول کا نر مادۂ تولید (pollen) بھرا ہوتا ہے جو بہت باریک پیلے رنگ کے ذرات کی شکل میں نظر آتا ہے۔اسے انگلی لگانے سے وہ پیلے ذرے انگلی پر بھی لگ جائیں گے۔ پھول کے عین وسط میں مادہ حصّہ یا تخم دان (ovary) ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک نسبتاً موٹی ڈنڈی کے ساتھ نیچے پھول کے اندرونی حصّہ میں موجود بیضہ سے منسلک ہوتا ہے۔اس ڈنڈی کا اوپری حصّہ نسبتاً چوڑا اور ہموار ہوتا ہے، جسے stigma کہتے ہیں۔ پولن جب سٹگما پر گرتا ہے تو وہ اس میں ایک نالی بنا کر سفر کرتا ہوا نیچے مادہ حصّہ بیضہ تک پہنچ کر اس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ یہاں سے بیج بننے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔اس عمل کو زرخیزی (fertilization) کہتے ہیں۔

مکھیاں جب پھولوں پر بیٹھتی ہیں تو ان کے پروں کی لرزش یعنی بھنبھناہٹ سے بھی پولن کی تیار تھیلیاں کھل کر پولن بکھیر دیتی ہیں جو مکھی کے روئیں دار جسم میں پھنس جاتے ہیں۔ جب یہ مکھی دوسرے پھول پر بیٹھی ہے تو کچھ پولن دوسرے پھول کے مادہ حصے پر لگ کر بیضہ تک منتقل ہوجاتا ہے۔کلی سے پھول بننے کے عمل کے دوران پتیوں کے رنگ اور خوشبو میں ہونے والی خفیف تبدیلیوں کو بھی مکھی محسوس کرلیتی ہے اور اسے علم ہوجاتا ہے کہ کون سے پھول میں کس وقت رس اور پولن تیار ملے گا۔

قدرت ایک ہی پھول کے نر اور مادہ حصّوں کے ملاپ یعنی خود زرخیزی (self fertilization) کی حوصلہ شکنی کرتی ہے، اگرچہ پودوں کی ایک قلیل تعداد اس طریقے سے بھی نسل کشی کرتی ہے۔جدید علم الوراثت (Genetics) سے معلوم ہوا ہے کہ ایک نسل کے آپس میں ہی بار بار جنسی ملاپ سے وراثتی تنوع کم ہوجاتا ہے جس سے ناقص بڑھوتری اور کئی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔اس کے برعکس دور پار سے تعلق رکھنے والے نر اور مادہ کے ملاپ سے بہتر نسل پروان چڑھتی ہے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ قدرت پودوں میں اس مقصد کو کیسے حاصل کرتی ہے۔

(ا) کئی پودوں میں جانوروں کی طرح نر اور مادہ پودے علیحدہ علیحدہ اُگتے ہیں۔ ایک میں صرف نر پھول لگتے ہیں اور دوسرے میں صرف مادہ پھول۔لہٰذا مادہ پھول پر اسی درخت کی بجائے کسی اور درخت سے آکر ہی پولن باروری کرے گا۔مثلاً پپیتا اور شہتوت۔

(۲) اکثر پودوں کے پھولوں میں نر اور مادہ حصّے اکٹھے بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک ہی پھول کے نر اور مادہ حصّے ایک ہی وقت کی بجائے مختلف اوقات میں تیار (mature) ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تیار پولن اسی پھول کے خام مادہ حصّے پر گر بھی جائے تو وہ اسے قبول نہیں کرے گا اور جب مادہ حصّہ تیار ہوتا ہے تو اس کے اپنے پھول کا پولن ختم ہو چکا ہوتا ہے اور کسی دوسرے پھول سے لایا جانے والا پولن ہی اسے زرخیز کرے گا۔ اس کی عام مثال گندم، چاول اور مکئی وغیرہ ہیں۔ ان کی زر پاشی مکھیوں یا دیگر جانداروں کی بجائے ہوا کے ذریعے عمل میں آتی ہے جو پولن کو اڑا کر مادہ حصّوں تک پہنچاتی ہے۔ اسی لیے ان فصلوں کے پھولوں میں رنگ، خوشبو اور رس نہیں ہوتا، کیونکہ زر پاشی کے لیے ان کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

(۳) کچھ پھولوں کی نر ڈنڈیاں (stamen) لمبی ہوتی ہیں جبکہ مادہ حصے کا style چھوٹا ہوتا ہے۔ کچھ پھولوں میں اس کے اُلٹ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پھول کا پولن اس کے مادہ حصے پر گرنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور شہد کی مکھیوں یا دیگر جانداروں سے لیا ہوا پولن ہی انہیں زرخیز بناتا ہے۔

(۴) کچھ پھولوں کے نر اور مادہ حصے ایک ہی جسامت کے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پولن کا اس پھول کے stigma پر گرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اپنا پولن خواہ اس پھول پر کتنا ہی گرے، وہ وہاں پرورش نہیں پا سکے گا اور وہیں ختم ہو جائے گا۔ یہ اتنا پیچیدہ عمل ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے خاطر خواہ حیاتیاتی علم کی ضرورت ہے۔ مزید برآں اگر اس طرح کے بندوبست نہ کیے جاتے تو ہر طرح کا پولن پھولوں پر لگ کر انہیں بارآور کر دیتا۔ یوں عجیب وغریب پودے اور بیج وجود میں آتے اور کسی بھی پودے کی کوئی شناخت نہ رہ جاتی۔ اسی طرح جانوروں میں بھی ایسا ہونا ناممکن ہے۔

غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں

گلوں میں رنگ کیسے بھرے جاتے ہیں؟ پنکھڑیوں سے خوشبوئیں کیسے پھوٹتی ہیں اور یہ خوشبوئیں شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کے دیس میں کیسے کیسے سندیسے بھیجتی ہیں؟ آبِ حیات کے شیریں قطروں سے پھول اپنے دامن کیسے بھرتے ہیں؟ ایک نیم واکلی کو کیسے علم ہو جاتا ہے کہ اسے

اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے کون سے رنگ بھرنے ہیں، کون سی خوشبو پیدا کرنی ہے تاکہ وہ شہد کی مکھیوں کو اپنی طرف متوجّہ کر سکے؟ شہد کی مکھیاں ۱۵۰ ملین سالوں سے اسی طرح چھتّا بنا رہی ہیں اور اسی طرح پھولوں سے رس اکٹھا کر کے شہد بنا رہی ہیں۔ اس عرصے میں نہ تو مکھیوں کے طور طریقے بدلے ہیں اور نہ ہی پھولوں کی شکل، رنگوں اور خوشبو میں تبدیلی آئی ہے۔ جو چیز جس کام کے لیے بنائی گئی ہے، وہ اسی طریقے سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہے۔

شہد کی مکھیوں اور پھولوں نے باہمی معاہدہ کب سے کیا ہوا ہے؟ اور کیا شہد کی مکھی نے اپنے جسم کو اس معاہدے کے تحت ڈھال لیا تھا یا وہ پہلے ہی سے ایسی تھیں؟ اس معاہدے سے پہلے پھولوں میں رنگ، خوشبو اور رس نہیں ہوا کرتا تھا؟ دونوں فریقین اس معاہدے سے پہلے اپنا وجود کیسے برقرار رکھے ہوئے تھے؟ بات صرف اتنی ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی کو اس کے کام کے مطابق بہترین ساخت دے کر اسے وحی کے ذریعے ہدایت کر دی گئی ہے اسی طرح پھولوں کو بھی بتا دیا گیا ہے کہ انہوں نے کتنا پولن اور رس تیار کرنا ہے، کب اور کیسے تیار کرنا ہے، کون سے رنگ بھرنے ہیں اور کون سی خوشبو پیدا کرنی ہے!

کھیتوں میں اُگے ہوئے سورج مکھی کے تمام پھولوں کی گردنیں کون موڑ کر مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کی طرف کر دیتا ہے؟ سورج مکھی کے پھول پر بیٹھنے والی مکھیاں تو ٹماٹروں، کدوؤں اور بینگنوں کے پھولوں سے بھی ہو کر آتی ہیں تو ان پودوں کا پولن جب سورج مکھی کے پھول کے زرگیروں (stigmas) پر پڑتا ہے تو ان سے ٹماٹر یا بینگن نما کوئی عجیب وغریب سبزی کیوں نہیں پیدا ہو جاتی؟ سورج مکھی کے پھول کی بیضہ دانیوں تک سورج مکھی کے پولن ہی کیوں پہنچ کر سورج مکھی کے پھول بناتے ہیں؟

سوچا کریں۔ کائنات میں غور وفکر کیا کریں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم سمجھ کر کیا کریں۔ ایسا کرنے سے احسن الخالقین کی قدرت وعظمت کا ادراک ہوگا اور یہ ادراک آپ کی عبادتوں میں لذت بھرا خلوص بھر دے گا۔ شہد سے بھی میٹھا اور شفا بخش!

آخر میں ایک دفعہ پھر سورۃ النحل کی محولہ بالا آیات (۶۸، ۶۹) کو پڑھیں۔ آپ کو شہد کی مٹھاس آئے گی اور خوشبو سے آپ کا دماغ بھی معطر ہوگا۔

❁❁❁

حُبّ النّبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

محمدؐ کی محبّت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے!

خالقِ کائنات کا فیصلہ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ (التوبۃ:۲۴)

''اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے' تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو' تمہارے رہنے کے مکان جو تمہیں پسند ہیں اللہ تعالیٰ' اُس کے رسولؐ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے (یعنی عذاب)۔''

گویا ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر رشتہ دار (باپ' بیٹے' بھائی اور بیوی) سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبّت کرے' ورنہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی نافرمانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (متفق علیہ)

''تم میں سے کوئی بندہ اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مَیں اُس کے نزدیک اُس کے والد' اُس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔''

حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپؐ نے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یقیناً آپؐ مجھے میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ پیارے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں' قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اُس وقت تک کہ مَیں تمہیں تمہاری جان سے بھی زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔'' عمرؓ نے ایک لمحہ سوچا اور پھر عرض کی: اللہ کی قسم! یقیناً اب آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمر! اب بات بنی ہے۔'' (صحیح بخاری) حضرت عمرؓ نے جب یہ کہا کہ آپ میری جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں تو آپؐ نے ان کی حُبّ النّبی کو صحیح قرار دیا۔ ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبّت ایمان کا لازمی جزو ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبّت کا فائدہ محب ہی کو پہنچتا ہے کہ اس کے ایمان کی تصدیق ہو جاتی ہے جو اُس کے گناہوں کی معافی کا باعث بنتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾﴾

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) کہہ دیجیے اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو' (اگر تم نے ایسا کیا تو) اللہ تعالیٰ تم سے محبّت کرے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا' وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبّت کا ثمر جنّت ہے' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ)) (صحیح البخاری) ''جو شخص جس سے محبّت کرتا ہوگا (آخرت میں) وہ اُسی کے ساتھ ہوگا''۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: قیامت کب آئے گی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے قیامت کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے؟ اُس نے عرض کی: ''اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبّت۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک تم اُسی کے ساتھ ہوگے جس کے ساتھ تم نے محبّت کی۔'' (صحیح مسلم) گویا جس شخص نے ایمان کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبّت کی ہوگی وہ آخرت میں آپؐ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''آپ اُس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی قوم سے محبّت تو کرتا ہے لیکن اُس نے اتنے نیک اعمال نہیں کیے جتنے انہوں نے

کیے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی اُسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس نے محبّت کی۔'' (متفق علیہ) گویا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی محبّت رکھنے والا آخرت کی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنّت میں ہوگا۔

یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ جس کو انسان محبوب رکھتا ہے' اُس کا کہنا مانتا ہے اور اُس کی اطاعت کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کی اطاعت کی جائے' جس کام کے کرنے کا آپؐ حکم دیں وہ کیا جائے اور جس کام سے روک دیں اُسے ہرگز نہ کیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں جس کام سے منع کروں اُس سے باز رہو اور جس کا حکم دوں اسے بقدر استطاعت بجالاؤ۔'' (صحیحین عن ابی ھریرہ) چونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں پر مہربان ہے اس لیے اس نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو نمونہ قرار دے دیا' تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ صحیح راستے پر چل سکیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔''

یعنی جن کاموں کو آپ ﷺ نے کیا ہے وہ تم بھی کرو اور جن سے آپؐ رُکے ہیں تم بھی رکو۔ ایسی زندگی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷)

''جو چیز تم کو پیغمبرؐ دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اُس سے باز رہو۔''

یہ آپ ﷺ کی اطاعت ہی ہے جو انسان کے لیے نجات کا باعث ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

((كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى' قِيْلَ: وَمَنْ اَبٰى؟ قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ ' وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى)) (صحیح البخاری)

''میری ساری اُمّت جنّت میں جائے گی سوائے اُس شخص کے جس نے انکار کر دیا۔ عرض کیا گیا: کس نے انکار کیا؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنّت میں جائے گا' اور جس نے میری نافرمانی کی تو اُس نے (جنّت میں جانے سے) انکار کر دیا۔''

اللہ تعالیٰ نے دین (طرزِ زندگی) مکمل کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے پورے کے پورے دین پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اب کسی کے لیے بھی اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے میں کسی

طرح کا شک نہیں رہا۔ حضور ﷺ دنیاوی زندگی کا عرصہ پورا کر کے تشریف لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا: ((تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ)) (الموطا عن ابی ھریرۃ) ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں' بس جب تک تم ان دونوں پر عمل کرتے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت''۔ قرآن تو اللہ کا کلام ہے جس میں اوامر بھی ہیں اور نواہی بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے زندگی گزاری۔ یوں سمجھئے کہ قرآن theory ہے اور آپ کی زندگی practical۔ آپؐ سے محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ یہ وہ پاکیزہ زندگی ہے جس سے اُخروی نجات ممکن ہو جائے گی اور جنّت میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ مل جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبّت کا صرف زبانی اقرار کافی نہیں اور نہ ہی محبّت کے اظہار کے خودساختہ طریقے مقبول ہیں۔ یہ خودساختہ طریقے تو بدعت کے زمرے میں آتے ہیں جو مردود ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) (متفق علیہ) ''جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی ایسا کام شروع کر دیا جو کہ اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔'' آپ ﷺ نے اپنے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سُنّت پر عمل کرنے کی ہدایت کر دی' اس طرح آپؐ کے طریقے کے مطابق عمل کرنے کے لیے مزید سہولت مل گئی۔ آپؐ نے فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''پس تم پر میری اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سُنّت لازم ہے۔''

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی محبّت اسی میں ہے کہ آپؐ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے وہ کیے جائیں اور جن سے روکا ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔ اسی میں حقیقی کامیابی ہے۔ محبّت کے لیے اطاعت لازمی ہے۔ اطاعت کے بغیر محبّت کا دعویٰ باطل ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے سچی محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں آپؐ کی اطاعت کی جائے۔

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

مُطالعۂ تاریخ

ایک ایمان افروز اور از خود آشکار ہونے والی حقیقت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے

انجینئر مختار فاروقی

تاریخ کا مطالعہ انسانی طبعی ضرورت ہے‘ بحث و تمحیص اور تجسّس کے جذبات کی تسکین کا سبب ہے۔ ماضی کے اشارات سے سبق حاصل کرنا اور آئندہ اجتماعی انسانی معاملات میں ان اسباق کو پیش نظر رکھنا کامیابی و کامرانی کی نوید ہے۔ تاہم اس میں ہر طرح کی اچھی بُری تحریر اور کتاب پڑھنے سے پہلے کسی خاص تاریخی مرحلے اور اہم انقلابی تبدیلی یا عروج و زوال پر فراہم کردہ معلومات کو اپنے دماغ میں انڈیلنے سے پہلے ’مصنّف‘ کی حدودِ اربعہ جاننا ضروری ہے۔ اس ضمن میں متعلقہ تاریخی مواد سامنے لانے والے مصنّف کی صحیح پوزیشن جانے بغیر contents کو مِن و عن قبول کرنے سے گریز ضروری ہے۔ یہ اصول پیش نظر رہے تو مطالعہ باعثِ برکت اور ذہن کی کشادگی کا سبب ہوگا‘ ورنہ ذہنی خلفشار اور دماغی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کو صرف ایک مثال سے سمجھنا ضروری ہے۔

یہ ایک واشگاف حقیقت ہے کہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی حکومت تھی‘ غیر مسلم اقوام اسلام کے زرّیں اصولوں کے مطابق پُرامن زندگی گزار رہی تھیں۔ جہانگیر کے عہد میں یورپی اقوام تجارت کی غرض سے بحر ہند میں آئیں اور ان غیر ملکی تاجروں نے دور دراز کے مظلوم مسافر بن کر مسلمان حکمران سے تجارتی درآمدی ٹیکس معاف کرالیا۔ پھر اس معافی کی آڑ میں اسلحہ لے آئے‘ مقامی غدار پیدا کیے‘ ان کی مالی مدد کی‘ ہندو کو مسلمانوں سے آزادی کا سبز باغ دکھا کر اپنی مدد پر آمادہ کیا۔ پھر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے بنگال ۱۷۵۷ء میں‘ پھر میسور ۱۷۹۹ء میں فتح کر لیے اور بالآخر ہندو کے تعاون سے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے خائف ہوکر ہندوؤں کو ساتھ ملایا‘ تجارت میں شریک کیا اور مسلمانوں کو بے دست و پا کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے جنگ آزادی لڑی جو بوجوہ ناکام ہوگئی۔ انگریز نے ۱۸۶۰ء کے بعد نئے دور کا آغاز کیا اور آہستہ آہستہ جمہوریت کو روشناس کرایا (ایک آدمی ایک ووٹ)۔ صاف ظاہر ہے کہ ہندو مسلمانوں سے تین گنا تھے‘ لہٰذا وہ مستقل حکمران رہتے۔ مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا اور یوں اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔

اب ان واقعات کو انگریز مصنّف لکھے گا تو اور طرح کا rationale سامنے لائے گا‘ ایک کٹر ہندو لکھے گا تو ایک بالکل دوسرا نقطۂ نظر‘ جو ہندو ذہن کا عکاس ہوگا‘ وہ سامنے آئے گا‘ جبکہ ایک سچّا مسلمان ان واقعات کو لکھے گا تو بالکل دوسرا انداز ہوگا۔ مغربی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کرنے والا ذہین برطانوی مصنّف انگریزوں کو حق بجانب ثابت کرے گا اور مسلمانوں کو ظالم‘ عیاش‘ بدمعاش‘ بدکار‘ شرابی اور کند ذہن ظاہر کرے گا‘ جبکہ ہندو مسلمان حکمرانوں کو انگریز کی طرح ظالم اور انگریز کو نجات دہندہ ثابت کر کے مسلمانوں سے ’بدلہ لینے‘ کا معاملہ ظاہر کرے گا۔ جبکہ کوئی مسلمان ذہن کا مؤرّخ تاریخ لکھے گا تو وہ مسلم ذہن کے مطابق جو حقائق ہیں وہ سامنے لائے گا۔ ہندو مؤرخ کا حوالہ مسلمان ذہن کے لیے سم قاتل اور گمراہ کن ہوگا اور انگریز مصنّفین کی تحریریں مسلمانوں کو ننگِ انسانیت‘ اُجڈ‘ کرپٹ اور انسان دشمن ظاہر کریں گی‘ جن میں مبالغہ کی حد تک حقائق کو مسخ کیا گیا ہوگا۔ لہٰذا تاریخ کا مطالعہ صرف مسلمانوں اور پاکستان کے بانیان کے نقطۂ نظر سے کرنا ضروری ہے اور اسی نقطۂ نظر کو پاکستان کے نصابِ تعلیم کا حصّہ بنانا ضروری ہے۔ افسوس کہ یہ صورتِ حال پاکستان میں ابتدا ہی سے مفقود ہے۔ اسی وجہ سے آج کا مسلم نوجوان ذہنی انتشار کا شکار ہے اور اصلاحِ احوال کے لیے یک رنگی‘ یگانگت اور مثبت سوچ کا فقدان ہے۔ تاریخ نگاری کے ذریعے دشمن قوموں کا یہ ایک نظریاتی حملہ ہی ہے اس سے متنبہ رہنا اور بچنا ضروری ہے۔

تاریخ پاکستان کا اس طرح مطالعہ پاکستان اور اُمّتِ مُسلمہ کے شاندار مستقبل کا ضامن ہے اور یہی نقطۂ نظر نصابِ تعلیم میں بھی شامل ہونا چاہیے۔ اعلیٰ کلاسوں میں تحقیق و مطالعہ کے لیے دوسروں کی کتاب پڑھنا کوئی برائی نہیں ہے بلکہ علم‘ روشنی اور باہمی افہام و تفہیم کا سبب ہے‘ لیکن خدا بیزار‘ انسان دشمن اور اسلام دشمن ذہن کو ابتدائی کلاسوں کے نصابِ تعلیم اور اخبارات و الیکٹرانک میڈیا سے پھیلانا پاکستان‘ نظریۂ پاکستان‘ علّامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے افکار سے فرار اور دو قومی نظریہ سے بغاوت ہے۔ تعلیم اور تعلیمی نصاب کے شعبے میں اس پر خصوصی توجّہ کی ضرورت ہے۔

بیت المقدس اور ہیکلِ سلیمانی

رضی الدین سیّد

مسلمانوں کی عظیم مسجد بیت المقدس اور یہودیوں کی معروف عبادت گاہ ہیکلِ سلیمانی دو الگ الگ عمارتیں ہیں یا ایک ہی عمارت کے دو نام ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنّوں کی مدد سے تعمیر کروایا تھا۔ اس دوران حضرت سلیمان علیہ السلام جنّات کی نگرانی کے لیے اپنے عصا کے سہارے کھڑے تھے کہ آپؑ کی روح قبض ہوگئی مگر آپؑ کا جسدِ مبارک اسی طرح کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ دیمک نے آپؑ کی لاٹھی کو کھا کر کھوکھلا کر دیا۔ اس دوران جنّات آپؑ کی موت سے بے خبر کام میں مصروف رہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ آپؑ کھڑے ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ادھر عہد نامہ مقدّس (بائبل) بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ یہودیوں کی عبادت گاہ ''ہیکل'' حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے ہاتھوں تعمیر ہوئی تھی' اور اسی مناسبت سے اسے صحائف میں ''ہیکلِ سلیمانی'' (Soloman's Temple) کہا جاتا ہے۔ تاریخی حقائق کیا ہیں؟ ذیل میں ایک جائزہ لیا جاتا ہے۔

☆ علّامہ ابنِ خلدون

معروف مؤرخ علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ ''تاریخ ابن خلدون'' جلد اول ''قبل از اسلام'' میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر بیت المقدس کے لیے ایک خصوصی جگہ کی نشان دہی حضرت ابرہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں کر دی تھی' مگر اس کی تکمیل حضرت داؤد علیہ السلام کے رخصت ہوجانے کے باعث حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی تھی۔ آپؑ نے اپنی حکومت کے چوتھے برس سے بیت المقدس کی تعمیر شروع کی جو آپؑ کی وفات تک برابر جاری رہی تھی۔ یہیں انہوں نے ایک متعیّن دن مذبح کے روبرو ہوکر بنظر تقرّب الی اللہ بائیس ہزار گایوں کی قربانی

Email:national.a.research@gmail.com

دی۔ اس کے بعد ہر برس تین مرتبہ قربانی کرتے تھے اور چھیاسٹھ قنطار سونا بیت المقدس پر چڑھاتے تھے۔ (ص: ۲۰۶'۲۰۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر بیت المقدس میں داخلے کے لیے صحرا سے روانہ ہوئے تو یروشلم ہی کے ایک مقام پر ٹھہرتے ہوئے انہوں نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ لکڑیوں کا ایک گنبد بنائیں' اس میں ''تابوتِ سکینہ'' رکھیں' اور یہیں ایک مذبح قربانی کے لیے بھی مقرر کریں۔ حکمِ الٰہی تھا کہ مذبح کے نگران حضرت ہارون علیہ السلام ہوں گے۔ بنی اسرائیل اس عبادت گاہ (قبے) میں داخل ہوتے تھے اور ایک سایۂ ابر وہاں آتا تھا جسے دیکھ کر وہ سجدے میں گر جاتے تھے۔ (اب بنی اسرائیل سجدہ نہیں کرتے: مؤلف) بنی اسرائیل اپنی نمازیں اسی گنبد کی جانب منہ کر کے ادا کیا کرتے تھے جو ان کے لیے کعبے کی حیثیت رکھتا تھا' جبکہ قربِ الٰہی کے لیے اس کے سامنے والی قربان گاہ میں قربانیاں کیا کرتے تھے۔ (ص: ۱۸۴)

علامہ کہتے ہیں کہ ''تاہم صورت حال یہ ہے کہ زمانۂ دراز گزر جانے کے بعد اب ہیکل کا نام ونشان بھی مٹ چکا ہے۔'' واضح رہے کہ علامہ ابن خلدون ''ہیکل'' کو جگہ جگہ ''مسجد'' بھی کہتے رہے ہیں۔

☆ نیٹ انسائیکلو پیڈیا

نیٹ انسائیکلو پیڈیا بتاتی ہے کہ مسجد اقصیٰ اس وقت جہاں واقع ہے' وہاں ۷۰ء عیسوی تک ہیکل ہوا کرتا تھا۔ تاہم رومی سپہ سالار طیطوس (Titus) نے یہودیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہوئے اسے مسمار کر کے اسے زمین بوس کر دیا تھا۔ اس مقام پر سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چھوٹی سی مسجد بنائی تھی جسے بعد میں اُموی خلیفہ عبدالملک نے مزید توسیع دی تھی۔ بعد ازاں ۷۰۵ء میں اُس کے بیٹے الولید نے اس کی مزید توسیع کی تھی۔ بدقسمتی سے ۷۴۶ء میں ایک زلزلے نے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا' جسے ۷۵۴ء میں پہلے عباسی خلیفہ المنصور نے' اور بعد ازاں ۷۸۰ء میں اس کے جانشین المہدی نے ازسرِ نو تعمیر کروایا تھا۔

۱۰۳۳ء میں وہاں ایک اور بڑا زلزلہ آیا جس کے باعث مسجد کا ایک بڑا حصّہ دوبارہ تباہ ہوگیا تھا۔ دو سال بعد اسے فاطمی خلیفہ ''الظاہر باللہ'' نے نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس دوران ہر خلیفہ نے اس میں توسیع وتزئین کا کام مسلسل جاری رکھا۔ اسی توسیع وتزئین کا حصّہ آج

کے گنبد اور مینار بھی ہیں۔

۱۰۹۹ء میں جب صلیبیوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو انہوں نے مسجد کو گرجا میں تبدیل کر دیا اور اسے ''ہیکلِ سلیمانی'' کہہ کر پکارنے لگے۔ انہوں نے وہاں اپنا شاہی اصطبل بھی قائم کر دیا۔ صلیبی دور ہی میں معروف دہشت گرد تنظیم ''نائٹ ٹیمپلرس'' نے بھی اپنا صدر دفتر بیت المقدس منتقل کرنا ضروری سمجھا۔

تاہم ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبیوں کو نکال باہر کر کے اس کی پرانی حیثیت بحال کر دی۔ یروشلم شہر پر قبضے کے فوراً بعد سلطان نے ایک ہفتے کے اندر اندر مسجد کو جمعہ کی نماز کے لیے نئے سرے سے تیار کروایا اور صلیبیوں کے قائم کردہ اناج گودام ختم کروا کے وہاں وضو خانہ قائم کیا' صحن میں قالین بچھائے' اور جگہ جگہ عرقِ گلاب کی خوشبو کا چھڑکاؤ کروایا تھا۔ صلاح الدین ایوبی کے فرماں روا سلطان نورالدین زنگیؒ نے مسجد کے محراب کے لیے ہاتھی دانت کا ایک قیمتی منبر بھی تیار کروایا تھا' تاہم زندگی انہیں اسے وہاں نصب کرنے کا موقع نہیں دے سکی۔ بعد ازاں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اُن کی جانب سے مسجد میں منبر کو نصب کیا تھا۔ اسی مناسبت سے منبر کو ''منبر ایوبی'' بھی کہا جانے لگا۔ یہی وہ منبر ہے جسے اگست ۱۹۶۹ء میں یہودیوں نے انتقاماً آگ لگائی تھی۔ بعد ازاں اپنے دور میں عثمانیوں نے مسجد میں ایک خوبصورت فوارے کا اضافہ کیا تھا۔ ماضی قریب میں اس تاریخی مسجد کی نگرانی فلسطینیوں کے محبوب مذہبی پیشوا مفتی امین الحسینیؒ کرتے رہے۔

۱۹۸۰ء میں اسرائیلی دہشت گرد تنظیم ''گُش امونیم'' کے دو افراد نے مسجد کو بم سے اڑانے کی کوشش کی تاکہ اس کی جگہ ہیکل کی تعمیر کے لیے عالمی یہودیوں کو بیدار کیا جا سکے۔

یروشلم پر فی الحال اگرچہ یہودیوں کا قبضہ ہے' لیکن مسجد کا انتظام و انصرام حسبِ سابق اب بھی اردنی و فلسطینی نگران اسلامی وقف کونسل کے ذمے ہے۔ (تاہم یہ انتظام محض کاغذی ہے' کیونکہ اس میں نگرانی و تفتیش کے اختیارات اسرائیلی فوجیوں کے پاس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آئے دن مسجد کو ان کے فوجی بوٹوں سے پامال ہوتے دیکھتے رہتے ہیں جس کے لیے کوئی بھی مسلم حکومت اسرائیل سے احتجاج نہیں کرتی۔)

۲۰۱۲ء میں یہ بات سامنے آئی کہ ایک ماہرِ ارضیات ''رابرٹ ہملٹن'' نے صہیون پہاڑی

پر (جس پر یہ مسجد قائم ہے)' ارضیاتی تحقیق کرتے ہوئے بتایا کہ مسجد کے نیچے ہیکلِ سلیمانی کے بعض آثار (پتھر وغیرہ) ملے ہیں۔

☆ دی کریسنٹ انٹرنیشنل' کینیڈا (جولائی ۲۰۱۴ء)

اس انگریزی رسالہ کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ اور اپنی اہلیہ محترمہ ہاجرہؓ کو اگرچہ مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود فلسطین واپس لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے وہاں ایک عبادت گاہ بھی قائم کی ہوگی جسے یہودیوں نے بعد میں ''بیت ایل'' کا نام دے دیا۔ اس میں ''ایل'' سے مراد اللہ ہے' یعنی اللہ کا گھر! چونکہ یہ مسجد انہی کی قائم کردہ اوّلین مسجد ''بیت اللہ'' سے اُس دَور کے حساب سے بے حد فاصلے پر تھی' اس لیے قران نے سورۃ الاسراء میں اسے ''المسجد الاقصیٰ'' (دُور کی مسجد) قرار دیا۔

فلسطین میں چونکہ ''فلسطی'' قوم کی اکثریت تھی اس لیے علاقے کا نام بھی فلسطین پڑ گیا۔ یہی وہ قوم تھی جس سے حضرت سلیمانؑ کی والدہ ماجدہ کا تعلق تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ ''اُر'' (موجودہ عراق) میں پیدا ہوئے تھے لیکن نمرود کی بادشاہت کے باعث انہیں وہاں سے نکل جانا پڑا تھا۔ پھر آپؑ فلسطین میں تشریف لائے تھے۔ آج کا شہر ''الخلیل'' دراصل حضرت ابراہیمؑ کی نسبت سے ہی اس نام سے پکارا جاتا ہے۔

بعد میں حضرت یوسفؑ کی حکمت سے حضرت یعقوبؑ اور اُن کا پورا خاندان جب فلسطین سے مصر منتقل ہو گیا تو مسجدِ اقصیٰ کی تولیت وہاں کی مقامی آبادی کے سپرد کی گئی۔ پھر بنی اسرائیل کی ضد اور بغاوت کے باعث جب یروشلم اور ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی بار بار تباہی و بربادی ہوئی تو حضرت سلیمانؑ نے مسجدِ اقصیٰ کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ بختِ نصر کے ہاتھوں ہیکل کی بربادی کا تفصیلی ذکر بائبل کی کتاب سلاطین کے باب دوم میں کیا گیا ہے' جس کا ایک چھوٹا سا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:

> ''بابل کے سپاہیوں نے معبود کے گھر [بیت ایل] میں تمام کانسہ کی چیزوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ کانسہ کے ستونوں [ہر ستون ۲۷ فٹ لمبا] پر شہتیر تھے جو ساڑھے چار فٹ لمبے تھے۔ بڑے کانسے کا حوض' گاڑیاں' جو سلیمان کے معبود کے گھر کے لیے بنائی گئی تھیں' ان چیزوں کا کانسہ اتنا وزنی تھا کہ اس کو تولا نہیں جا سکتا تھا۔'' (ایضاً۔ آیت ۱۶۔۱۷)

☆عبداللہ یوسف علی

معروف انگریزی مفسّر ومترجم قرآن عبداللہ یوسف علی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ یا ہیکل کو ۱۰۰۴ ق م میں تعمیر کروایا تھا۔ ۵۸۶ ق م میں بخت نصر نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ پھر حضرت نہمیاہ اور حضرت عزیر علیہما السلام نے ۵۱۵ ق م میں اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ لیکن یہ عمارت ایک بار پھر تخریب کی زد میں آئی، جبکہ ۷۰ء میں رومی شاہ طیطوس نے اسے زمین بوس کر دیا۔ ایک طویل عرصے بعد اموی خلیفہ عبدالملک نے اس کی تعمیر دوبارہ کروائی۔ عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یروشلم کی پہاڑی ''موریاہ'' (گنبدِ صخرہ) پر ایک نئی مسجد تعمیر کروائی تھی۔ مفسّر کے مطابق بھی ہیکلِ سلیمانی اور مسجدِ اقصیٰ ایک ہی عمارت کے دو نام ہیں۔

(The Holy Quran,Vol II , Sh Mohammad Ashraf , Lahore.

حاشیہ سورہ بنی اسرائیل۔ صفحہ ۶۹۱)

☆دیگر ذرائع

قرآنِ پاک کے دیگر مفسّرین اس ضمن میں مندرجہ ذیل رائے دیتے ہیں:

۱) مولانا ابوالکلام آزاد: سورۃ الاسراء کی پہلی آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''پاکی ہے اُس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو) راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کہ اُس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے، سیر کرائی، اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اُسے دکھا دیں۔ بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی، دیکھنے والی ہے!'' مولانا تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''یہاں مسجدِ حرام سے مقصود مکہ ہے اور مسجدِ اقصیٰ سے بیت المقدس کا ہیکل! اسے ''اقصیٰ'' اس لیے فرمایا کہ عرب کے لیے قریب کی عبادت گاہ خانہ کعبہ تھی اور دور کی عبادت گاہ ہیکل۔'' (تفسیر ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۳۴۶)۔ مولانا کے خیال میں ہیکل اور مسجدِ اقصیٰ ایک ہی عمارت کے دو نام ہیں۔

۲) علامہ ابنِ کثیر: معروف قدیم مفسر علامہ ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے جو ایلیا (شہر کا قدیم نام) میں واقع ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے انبیاء علیہم السلام کا مرکز رہا ہے۔ مسجد کو دور کی مسجد اس لیے کہا جاتا ہے کہ مکّہ سے مسجدِ اقصیٰ تک

ایک ہی رات میں سیر کروائی گئی تھی، جبکہ اس کی مسافت جانوروں کی رفتار کے لحاظ سے سوا مہینے کے برابر تھی۔

۳) محمد اسد: نومسلم عرب مفسّر محمد اسد نے بھی اپنے ترجمہ قرآن میں مسجدِ اقصیٰ سے ہیکلِ سلیمانی ہی مراد لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یروشلم میں مسجدِ اقصیٰ (ہیکل) اور مکّہ میں کعبہ کا ذکر قرآن میں ایک ساتھ آنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے دین کو اللہ تعالیٰ نے دونوں جگہ ایک ہی بتایا ہے۔

(The Message of Quran ,Published by Darul Andalus , Gibralter, 1980)

خلاصہ

ہمیں معلوم ہے کہ قدیم دور میں معلوم دنیا عمومی طور پر مشرقِ وسطیٰ تک محدود تھی۔ اسی لیے بیشتر انبیاء کرامؑ بھی انہی علاقوں میں مبعوث ہوتے رہے۔ حضرت آدم و ملائکہ علیہم السلام کی مشترکہ تعمیر کے بعد ع ''دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا!'' (یعنی خانہ کعبہ) جب طوفانِ نوحؑ کے نتیجے میں ختم ہو گیا تو اس کے بعد اسے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ ازسرِ نو تعمیر کروایا تھا۔

اس کے چالیس سال بعد مشرقِ وسطیٰ (فلسطین یا شام میں، کیونکہ فلسطین ہمیشہ سے شام کا ایک صوبہ رہا ہے) ایک دوسری مسجد اقصیٰ یا ہیکل تعمیر کی گئی تھی۔ یروشلم ہی میں اولادِ ابراہیمؑ میں سے بہت سے انبیاء کے مزارات پائے جاتے ہیں۔

یقیناً اس مقام پر اصل عمارت مسجد ہی کی ہے، لیکن بعد میں یہودیوں نے اسے مسجد کے بجائے ''ہیکل'' کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا، جس کا ذکر بڑے شدّ و مدّ سے ان کی مقدّس کتاب عہد نامۂ قدیم (بائبل) میں ملتا ہے۔ یوں بھی عقل یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ اللہ کے محبوب نبی حضرت سلیمان علیہ السلام اگر اپنے رب کی منشا کے مطابق کوئی عبادت گاہ تعمیر کروائیں گے تو مسجد کی جگہ وہ اسے کچھ اور کہہ کر پکاریں گے! اللہ کی خاطر کوئی بھی نبی عبادت گاہ بنوائے گا تو اُسے مسجد ہی کہہ کر پکارے گا۔ ممکن ہے کہ اس دور میں عمارت کا نام ہیکل یا مسجد نہ ہو بلکہ اس کے لیے کوئی اور مناسب سی اصطلاح پائی جاتی ہو، جسے بعد میں یہودی رِبیوں نے اپنے مطلب اور دوسری عبادت گاہوں سے ممیّز کرنے کی خاطر ہیکل کہہ کر پکارنا شروع کر دیا ہو۔ یہودیوں

نے اپنے کینے اور تعصب کے باعث تورات اور صحف انبیاء کے ہر ہر صفحے کو اپنی خواہشات کی نذر کیا ہے۔ جس زبان میں تورات اتری تھی‘ وہ زبان اب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ موجودہ بائبل بھی یونانی زبان سے عبرانی میں ترجمہ کی گئی ہے۔

بعض احادیث سے بھی یہ اشارات ملتے ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ دنیا کی دوسری بڑی مسجد ہے اور اس کی تعمیر خانہ کعبہ کے چالیس سال بعد یروشلم میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ عبادت گاہ یہ مسجد اقصیٰ ہی ہے۔ قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء) میں آیا ہے‘ جہاں ان کے بقول ہیکل موجود تھا۔ اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو یہ بات سمجھانی تھی کہ جس عبادت گاہ کو تم ہیکل کہتے ہو‘ وہ یہی مسجد اقصیٰ ہے۔ ایک اور قابلِ توجّہ نکتہ یہ بھی ہے کہ بعض مفسّرین نے یہاں کعبے کو بھی ’’ٹیمپل‘‘ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی

Temple of Kaaba, the first Temple set up for mankind

ڈکشنری میں بھی ’’ٹیمپل‘‘ سے عمومی مراد عبادت خانہ ہے۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ مسجدِ اقصیٰ کو گرا کر یہودی ایک بار پھر اپنا وہی قدیم ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو ۷۰ء کے رومی حملے کے بعد پھر کبھی تعمیر نہیں ہو سکا ہے۔ یہ اُن کے ’’گریٹر اسرائیل‘‘ منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار تو ’’گریٹر اسرائیل‘‘ قائم ہو کر رہے گا‘ لیکن پھر یہی ان کا عظیم تر قبرستان بنے گا۔ ❁❁❁

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے　　اشاعتِ عام: 35 روپے

علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۲)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

طبقاتِ مفسّرین

صاحب کشف الظنون نے اس ضمن میں درج ذیل درجہ بندی کی ہے:

(۱) پہلا طبقہ: اصل شارح قرآن اور مفسّر وحیٔ الٰہی تو حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ اس کے بعد مفسّرین میں سب سے اعلیٰ طبقہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اُمّت میں یہی نفوس قدسیہ قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب ہیں۔ انہی کے سامنے حضرت جبریل امینؑ وحی (کلام اللہ) لے کر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ انہی حضرات کو حضورِ اقدس وحی پڑھاتے اور اس کے مطالب سمجھاتے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر مضامینِ قرآنی کو جاننے اور سمجھنے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ ہر کلام کی حقیقی اور کامل مراد متکلّم اور مخاطب سے بڑھ کر دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے عمومی طور پر تمام صحابہ کرامؓ مفسّرین کے پہلے طبقے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کے فیض صحبت سے ان کے قلوب میں یہ استعداد پیدا ہوگئی تھی کہ وہ قرآن کریم کے مشکل اور گہرے مقامات نیز اس کے اَسرار و لطائف کو نہ صرف خود سمجھ سکیں بلکہ دوسروں کو بھی سمجھا سکیں۔ مگر اس وصف میں مشترک ہونے کے باوجود حضرات صحابہؓ کے اذہان، ذوق اور قابلیتیں متفاوت اور گوناگوں تھیں۔ اس بنا پر تتبع سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دس حضرات دوسرے تمام صحابہؓ پر اس وصفِ تفسیر میں نمایاں اور فائق تھے۔ یعنی حضرات ابوبکر صِدّیق، عمر، عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، اُبی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔ خلفائے راشدین میں سے تفسیری روایات حضرت علیؓ سے کثرت سے منقول ہیں۔ ابوالطفیل سے روایت ہے کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو حاضر تھا اور وہ خطبہ دے رہے تھے۔ دورانِ خطبہ آپؓ نے فرمایا:

سلونی فو اللہ لا تسألونی عن شیء الا اخبرتکم، وسلونی عن کتاب اللہ، فواللہ ما من آیۃ الا وانا اعلم أبلیل نزلت أم بنہار أم فی سہل أو فی جبل

''اے لوگو! دریافت کرلو مجھ سے (احکامِ دین)، خدا کی قسم! جو بھی کوئی چیز تم مجھ سے پوچھو گے میں تمہیں بتادوں گا، پوچھ لو تم مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں (جو چاہو)، خدا کی قسم! کوئی بھی آیت ایسی نہیں کہ میں اس کو نہ جانتا ہوں کہ وہ رات میں اُتری یا دن میں یا نرم اور ہموار میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑوں میں۔''

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد ان دس حضرات میں سب سے فائق ترجمان القرآن حِبْرُ الْاُمَّۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اور ان کو فائق ہونا ہی چاہیے تھا کہ حضور ﷺ کی آپ کے حق میں دعا ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَاب وَالْحِکْمَۃ وَالتَّأْوِیْل'' ایک کھلی ہوئی شہادت بھی ہے اور ضمانت بھی۔ صاحبِ ''جوہر الحسان'' کے مطابق طبقۂ صحابہ میں صدر المفسّرین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد درجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضرت ابن عباسؓ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے اسی علمی امتیاز اور فوقیت کے باعث حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلس میں اکابر صحابہؓ کے برابر کا مقام رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متعدد تفسیری مجموعے منسوب ہیں، لیکن ان کی طرف معتبر سند علی بن ابی طلحہ الہاشمی کے مجموعے کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بعد مفسّرین صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا درجہ ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شرف و فضل کے لیے یہی کافی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے جن چار صحابہ سے علومِ قرآنی سیکھنے کے لیے ارشاد فرمایا، ان میں سب سے مقدّم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ ان کی تفسیری روایات بھی بہت ہیں۔ اس کے بعد حضرت اُبی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا درجہ ہے۔ امام سیوطیؒ کہتے ہیں کہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک بڑا تفسیری مجموعہ صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے، جس کو ابوجعفر الرازی بروایت ربیع بن انس، ابوالعالیہ سے نقل کرتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس کا بہت سا ذخیرہ روایت کیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے صحابہؓ سے بھی روایات تفسیر منقول ہیں لیکن ان کی تعداد قلیل ہے۔ جیسے حضرات انس بن مالک، ابوہریرہ، ابن عمر، جابر اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بہت سی روایات، قصص و واقعات، احوالِ فتن اور احوالِ آخرت سے متعلق مروی ہیں، جن میں

سے بعض قصص اور واقعات پر مشتمل روایات اہلِ کتاب سے بھی منقول ہوئی ہیں۔

(۲) دوسرا طبقہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد مفسرین میں دوسرا طبقہ تابعین کا ہے، یعنی وہ حضرات جن کو اصحابِ رسولؐ سے فیض اور شرفِ تلمذ حاصل ہوا، جیسے مجاہد، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح، طاؤس اور سعید بن جبیر وغیرہ رحمہم اللہ۔ امام ابن تیمیہؒ کا کہنا ہے کہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم اہلِ مکّہ ہیں، کیونکہ وہ کثرت سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ عکرمہؒ تو ان کے آزاد کردہ غلام ہیں اور تمام متاخرین کی کتب تفسیر انہی کی روایاتِ تفسیر سے بھری ہوئی ہیں۔ کوفہ میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے شاگردوں کی کثیر جماعت تھی، جیسے علقمہ، مسروق، اسود وغیرہ۔ اہلِ مدینہ میں بھی ایک جماعت صحابہؓ کے شاگرد مفسّرین کی تھی، جیسے زید بن اسلم، جن سے ان کے بیٹے عبدالرحمٰن اور امام مالکؒ روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح حسن بصری، عطاء بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب قرظی، ابوالعالیہ، ضحاک بن مزاحم، عطیہ عوفی اور قتادہ وغیرہ رحمہم اللہ تمام حضرات ائمہ تفسیر تھے اور جو کچھ وہ کہتے تھے، یقیناً صحابہ کرامؓ سے سنا اور سمجھا ہوتا تھا۔ (البیان فی علوم القرآن)۔ فن تفسیر میں ان سب سے فائق مجاہدؒ ہیں۔ فضل بن میمون سے منقول ہے کہ انہوں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابن عباسؓ کے روبرو تیس بار قرآن پاک کو پیش کیا (سنایا)، جس میں ہر آیت کی مراد، شانِ نزول اور یہ کہ وہ کب نازل ہوئی، دریافت کرتا تھا۔ امام نووی کا کہنا ہے کہ جب کسی آیت کی تفسیر مجاہدؒ سے منقول ہو تو وہ کافی ہے۔ ابن تیمیہؒ کا کہنا ہے کہ امام شافعیؒ، امام بخاریؒ اور اکثر ائمہ مجاہد کی ہی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں۔ سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ تفسیر چار اشخاص سے حاصل کرو، یعنی سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ۔ بقول قتادہ تابعین میں سب سے زائد اعلم چار اشخاص ہیں یعنی عطاء بن ابی رباحؒ مناسکِ حج (احکامِ حج) کے سب سے بڑے عالم ہیں، سعید بن جبیرؒ تفسیر کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، عکرمہؒ سیر (مغازی) کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں، اور حسنؒ (بصری) حلال وحرام کی سب سے زیادہ خبر رکھنے والے ہیں۔ امام شعبی کہا کرتے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر عکرمہؒ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا کوئی عالم نہیں ہے۔

(۳) تیسرا طبقہ: حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ کے بعد اس طبقہ (تبع تابعین) میں باضابطہ کتب تفسیر کی تدوین کا دور شروع ہوا۔ اس دور کے مفسّرین نے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے اقوال و روایات کو جمع کر کے علیحدہ کتب تفسیر کا آغاز کیا اور بکثرت تفاسیر تحریر ہوئیں۔ مثلاً تفسیر سفیان بن

عینیہ، تفسیر وکیل بن الجراح، تفسیر شعبہ بن الحجاج، تفسیر یزید بن ہارون، تفسیر عبدالرزاق، تفسیر آدم بن ابی ایاس، تفسیر اسحاق بن راہویہ، تفسیر روح بن عبادہ، تفسیر عبد بن حُمید، تفسیر امام شافعی، تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ رحمہم اللہ۔ اسی طبقہ میں ابن جریج، سدی، ابن قتیبہ، شیخ ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی، قاضی ابی اسحاق اسماعیل ازدی، شیخ ابوالحسن علی بن حجر اور ابومحمد عبداللہ بن مسلم دینوری (صاحب مشکل القرآن وغریب القرآن) رحمہم اللہ شامل ہیں۔

(۴) چوتھا طبقہ: تفاسیر طبقۂ سوم میں بعض ضعیف اور منکر روایات درج ہوگئی تھیں۔ اس لیے چوتھے طبقے کے مفسرین نے قدرے تنقیح وتحقیق کی رعایت کے ساتھ کلام اللہ کی تفسیر میں وجوہِ اعراب واحکام ومسائل کے استنباط کا بھی لحاظ کیا، اگرچہ ان کی تنقیح وتحقیق کا وہ معیار نہ تھا جو کہ امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے صحیحین کے لیے اختیار کیا۔ اس طبقہ کی تفاسیر میں سے سب سے عظیم المرتبت تفسیر ابن جریر طبریؒ ہے، امام نوویؒ اور امام جلال الدین سیوطیؒ نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ ہر دور کے ائمہ مفسّرین میں تفسیر طبری کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اس میں روایات تفسیر کا پورے طور پر استیعاب ہوا ہے۔ ابن جریر طبری نامی ایک اور شخص بھی گزرا ہے جو فرقۂ کرامیہ اور شیعہ سے تعلق رکھتا تھا، نام کے اشتراک سے بسا اوقات دھوکہ ہو جاتا ہے۔ اسی طبقہ میں ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن حبان، ابن مردویہ، ابوالشیخ، ابن المنذر، احمد بن داؤد نحوی دینوری، شیخ ابوالحسن علی بن موسوی حنفی اور شیخ ابوبکر احمد بن محمد جصاص رازی حنفی رحمہم اللہ بھی شامل ہیں۔ ان ائمہ نے متعدد تفسیری مجموعے تصنیف کیے، جیسے شفاء الصدور، کتاب الاشارات اور تفسیر ابواب القرآن وغیرہ۔

(۵) پانچواں طبقہ: اس طبقے میں بہت سے مفسّرین گزرے ہیں جنہوں نے اپنی کتب تفسیر میں اسناد حذف کر کے صحابہؓ اور تابعینؒ کی طرف اقوالِ تفسیر کی نسبت کی ہے اور انہی کی روایات کو اپنی کتب میں اکٹھا کیا، مثلاً امام ابومحمد عبداللہ جوینی، شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری، ابوالحسن احمد واحدی، مکی بن ابی طالب حموشی نحوی اور شیخ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی وغیرہ رحمہم اللہ۔ اس طبقہ کے بعض لوگ غیر مستند اور اہلِ سُنّت والجماعت کے مسلک سے منحرف تھے، بلکہ اعتقاداً ان پر تشیع اور رفض کا اثر تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنی تفاسیر میں اپنے مسلک کے مطابق ہر قسم کی رطب و یابس روایات جمع کر دیں۔ اسی ضمن میں ابواسحاق احمد ثعلبی کی طرف ایک بڑی تفسیر کی نسبت ہے، مگر اس میں بہت کچھ جھوٹے قصے اور غلط سلط روایات جمع کی ہوئی ہیں۔ مرتضیٰ علم الہدیٰ شیعی نے ثعلبی کو اپنا ہم

مسلک شمار کیا ہے۔ اسی طرح ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی نیشاپوری کی تفسیر کا حال ہے' اس میں بھی بے اصل روایات اور بہت کچھ خرافات بھری پڑی ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی تفاسیر غیر معتبر اور گمراہ کن ہیں' جن سے بچنا ہی لازم ہے۔

(۶) چھٹا طبقہ: اس میں وہ مفسّرین شامل ہیں جو چھٹی صدی ہجری میں گزرے۔ گزشتہ پانچ طبقات کے مفسّرین نے زیادہ تر روایات و آثار کو ہی جمع کرنے کا لحاظ رکھا تھا' لیکن چھٹے طبقے کے مفسرین مختلف حیثیات کے پیش نظر تفسیر قرآن کی طرف متوجہ ہوئے۔ کسی نے علومِ صرف ونحو اور قواعد عربیہ کو مدِّنظر رکھ کر تفسیر کی ہے' جیسے شیخ نور الدین ابوالحسن علی بن الحسین باقولی نے کتاب الکشف تالیف کی۔ کسی نے فقہی مسائل اور احکام کے استنباط اور ان کی تائید وتثبیت کو اپنی تفسیر کا عنوان بنایا۔ کسی نے متکلمانہ اصول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے فلاسفہ کے اشکالات اور مسائل کا ردّ کیا۔ عارفین اور صوفیاء نے سلوک وتصوّف کے نکات ولطائف کو ہی اپنا مقصد ٹھہرایا۔ کسی نے مفرداتِ قرآن کی تحقیق پر اپنی تالیف کی بنیاد رکھی' جیسے امام راغب اصفہانی کی کتاب المفردات۔ کسی نے فصاحت و بلاغت کے قواعد کے تحت اعجازِ قرآن اور اس سے متعلق لطائف نیز اصولِ عربیہ کو اپنی تفسیر میں جمع کیا' جیسے امام ابوالقاسم محمد بن عمر زمخشریؒ کی تفسیر کشاف وغیرہ۔ امام ابوحامد محمد بن محمد غزالیؒ صاحبِ جواہر القرآن اور یاقوت التاویل نیز امام ابومحمد حسین بن محمود بغویؒ صاحبِ تفسیر معالم التنزیل بھی اسی طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔

(۷) ساتواں طبقہ: اس میں ساتویں صدی ہجری کے مفسرین کا شمار ہوتا ہے' ان میں ممتاز اور نمایاں ہستی امام فخر الدین رازیؒ کی ہے' جن کی تفسیر 'مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر' علومِ نقلیہ وعقلیہ اور معارف وحِکم کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ امام رازیؒ نے اس میں فلاسفہ اور ملحدین کا ردّ دلائل عقلیہ اور اصولِ کلام سے خوب کیا ہے۔ اثباتِ ربوبیت والوہیت کے وہ گراں قدر مباحث ہیں جن کے لیے یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ اُمّتِ مُسلمہ پر ان کا ایک بڑا احسان ہے۔ البتہ فلاسفہ کے ردّ میں بعض ضمنی مسائل اور مباحث سے کچھ لوگوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تفسیر سے یہ امور خارج ہیں' اس لیے وہ اس طرز پر نکتہ چینی اور تفسیر پر اعتراض کرتے ہیں۔ حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا کہنا ہے کہ تفسیر کبیر کے بارے میں یہ اعتراض کہ 'فیہ کل شیء الا التفسیر' (اس میں سب کچھ ہے سوائے تفسیر کے)' اس تفسیر کو اس کے بلند مرتبے سے گرانا ہے۔ امام محمد بن ابی بکر

رازیؒ کی تفسیر لغاتِ قرآن کے موضوع پر ہے۔ قاضی ناصر الدین بیضاویؒ بھی اسی طبقے کے امام اور مفسر ہیں۔ 'انوار التنزیل واسرار التاویل المعروف تفسیر بیضاوی' ان کی نہایت نافع اور جامع تفسیر ہے' عنوان کے لحاظ سے بظاہر ایک کتاب لیکن درحقیقت بہت سی عظیم الشان تفاسیر کا لُبِّ لُباب اور جوہر ہے۔ قواعد عربیہ اور معانی و بیان سے تعلق رکھنے والے حقائق ومعارف تفسیر کشاف سے ماخوذ ہیں۔ علوم عقلیہ' حکمت وکلام اور اَسرارِ کلام اللہ سے متعلق مباحث کا تعلق تفسیر کبیر سے ہے۔ لغاتِ قرآن کی تحقیق میں مفردات القرآن از امام راغب اصفہانی کا جوہر نکالا گیا ہے۔ خود اپنی طبعی اور ذہنی پرواز اور فن کلام میں مہارت کے باعث جن خوبیوں کا امام بیضاویؒ نے اختصار و جامعیت کے ساتھ اضافہ فرمایا ہے' اس پر اہل نظر وفکر متحیر ہیں' اسی بنا پر تفسیر بیضاوی صدیوں سے اہلِ مدارس کے ہاں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' ہر دور میں علمائے کرام اس کے حواشی اور شروح لکھتے رہے ہیں۔ لیکن روایتی حیثیت سے محدثانہ اصول کے مطابق اس کا مرتبہ بہت اعلیٰ نہیں۔ فضائل سور میں بعض مقامات پر ضعیف اور منکر روایات نے جگہ پالی ہے۔

(۸) آٹھواں طبقہ: اسی طبقے میں ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفیؒ ہیں' جن کی تفسیر 'مدارک التنزیل و حقائق التاویل' اگرچہ مختصر لیکن نہایت مفید ہے۔ اسی طرح حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر علماء میں نہایت مقبول ہے۔ آپ شافعی مسلک کے پیروکار اور حافظ ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے۔ آپ کی تفسیر ابن جریر کی تفسیر کا خلاصہ اور روایاتِ تفسیر کا نہایت عمدہ ذخیرہ ہے' روایت ودرایت کی جامعیت میں تفسیر ابن کثیر بے نظیر ہے۔ حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے مستغنی کر سکتی ہے تو وہ صرف 'تفسیر ابن کثیر' ہے جو کہ 'تفسیر ابن جریر' سے بے نیاز کر دینے والی ہے۔ امام شرف الدین حسن بن محمد جو کہ امام طیبیؒ کے نام سے مشہور ہیں' وہ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' ان کی تفسیر 'فتوح الغیب عن قناع الریب' بہت نافع تفسیر ہے۔ علامہ طیبیؒ کا تفسیر کشاف پر چھ جلدوں پر مشتمل ایک حاشیہ بھی ہے۔ اس دور کے آخری حصے کے مفسرین میں سے علامہ سعد الدین تفتازانیؒ بھی معروف ہیں۔

(۹) نواں طبقہ اور اس کے بعد کے مفسّرین: اس میں نویں صدی ہجری اور مابعد کے مفسّرین ہیں۔ ان میں ممتاز شیخ جلال الدین محلی شافعیؒ ہیں۔ 'تفسیر جلالین' کے آخری حصے سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء) سے لے کر سورۃ الناس تک کی تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مُلّا مخدوم

مہائمیؒ کی تفسیر 'تبصیر الرحمٰن' عجیب وغریب انداز میں ہے' نہایت عمدہ طریقے پر ربطِ آیات وسُور کا التزام کیا گیا ہے۔ اس میں صوفیانہ معارف ولطائف بھی بکثرت ہیں۔ مشہور ہے کہ مُلّا صاحب نے یہ علوم روحانی طور پر حضرت خضر سے حاصل کیے تھے۔ شیخ محلیؒ کے بعد شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اسی طرز پر سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۂ بنی اسرائیل تک 'تفسیر جلالین' کے پہلے حصے کو بھی مکمل کر دیا۔ بہترین طور پر اختصار کے ساتھ تفسیر قرآن کی گئی ہے۔ اسی طرح شیخ ابوالسعود محمد بن عمادی حنفیؒ کی تفسیر اپنی افادیت میں تفسیر کشاف اور بیضاوی کے تقریباً ہم پلہ شمار ہوتی ہے۔ ان طبقات اور ادوار کے بعد سے آج تک ہر زمانے کے مفسّرین اور محقّقین تفاسیر قرآنی لکھتے رہے اور ان شاء اللہ قیامت تک علمائے اُمّت اس کارِ خیر میں مصروف رہیں گے۔ یہ صلحائے کرام اپنی تفاسیر اور علمی کارناموں سے حضورِ اقدس ﷺ کے قرآن سے متعلق اس فرمان کی تصدیق کرتے رہیں گے کہ ((لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ)) ''یہ اللہ کا وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب ولطائف کبھی بھی ختم نہ ہوں گے۔''

تفسیر کے مصادر و مآخذ

تفسیر قرآن کے مصادر و مآخذ درج ذیل ہیں:

(ا) قرآن مجید

فہمِ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم میں ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی' اجمال بھی ہے اور تبیین بھی' مطلق ومقید بھی ہے اور عام وخاص بھی۔ جو بات ایک جگہ مختصر بیان ہوئی ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل ہے' جو ایک جگہ مجمل ہے تو دوسری جگہ مفصل مذکور ہے۔ جو بات ایک اعتبار سے مطلق ہے تو ایک اور جگہ دوسرے پہلو سے مقید ہے۔ جو بات ایک آیت میں عام ہے تو دوسری آیت میں خاص ہے۔ اب جو کوئی بھی قرآن پاک کی تفسیر کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لیے لازم ہے کہ کلام الٰہی میں ایک موضوع پر وارد ہونے والی تمام مکرر آیات کو جمع کر کے ان کا تقابل کرے۔ اس طرح مفصّل آیات سے مجمل آیات کے سمجھنے میں مدد ملے گی اور مبیّن آیات کا فہم وادراک مجمل کا مفہوم متعیّن کرنے میں ممد ثابت ہوگا۔ اسی طرح اس کے لیے ضروری ہے کہ مطلق کو مقید پر اور عام کو خاص پر محمول کرے۔ یہ گویا تفسیر القرآن بالقرآن ہے' جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا۔ مثلاً حضرت آدمؑ اور ابلیس نیز حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ

بعض جگہ مختصر بیان ہوا ہے اور بعض مقامات پر تفصیل سے۔ اب جب تک تمام آیات سامنے نہ ہوں گی' مکمل واقعہ کا صحیح طور پر سمجھنا محال ہوگا۔ سورۃ المؤمن میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ ؕ﴾ (آیت ۲۸) ''اور اگر یہ رسول سچا ہے تو جس عذاب کا وعدہ وہ تم سے کرتا ہے' اس میں سے کچھ تمہیں ضرر پہنچے گا''۔ آگے اسی سورت میں اس مجمل کی وضاحت ہوتی ہے: ﴿فَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ﴾ (آیت ۷۷) ''جس بات کا وعدہ ہم ان سے کرتے ہیں' اگر اس میں سے کچھ آپؐ کو دکھا دیں''۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اوپر جس وعدے کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے دُنیوی عذاب مراد ہے۔

امام غزالیؒ نے مطلق کو مقید کرنے کی یہ مثال پیش کی ہے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت وضو میں فرمایا گیا: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ (آیت ۶) ''اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو''۔ آگے اسی آیت میں تیمم کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ؕ﴾ (آیت ۶) ''پس اپنے چہروں اور ہاتھوں کو اس سے مل لو''۔ یہاں مطلق ہاتھ کا ذکر ہے' تحدید وتعیین نہیں کی گئی۔ لیکن اوپر کے حکم کے حوالے سے مقید کرتے ہوئے یہاں بھی ہاتھ کہنیوں تک مراد ہوں گے۔

عام کو خاص پر محمول کرنے کی مثال دیکھیے کہ آیت قرآنی: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۵۴) ''اس سے قبل کہ وہ دن آئے' جس روز نہ سودابازی ہوگی' نہ دوستی اور نہ (ہی) سفارش''۔ میں دوستی اور سفارش کی نفی بطریق عموم کی گئی ہے۔ پھر سورۃ الزخرف میں اس عام کو خاص کرتے ہوئے متقیوں کو دوستی کی نفی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ ﴿اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''اُس روز دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے سوائے متقیوں کے''۔ اسی طرح اذنِ الٰہی پر مبنی سفارش کو سورۃ النجم میں مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ﴾ (آیت ۲۶) ''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کوئی فائدہ نہیں دیتی مگر اللہ کی اجازت کے بعد'' وغیرہ۔

(ب) احادیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا

نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ﴿۴۴﴾ (النحل) ''اور ہم نے آپ پر قرآن (الذکر) نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کردیں اور تاکہ وہ غور وفکر کریں''۔ اسی طرح فرمانِ نبویؐ ہے: ''سنو! مجھے کتاب دی گئی اور اس کی مانند ایک اور چیز بھی۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پیٹو آدمی مسند سے ٹیک لگائے یوں کہے کہ (صرف) قرآن کا دامن تھامے رکھو جس چیز کو اس میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس چیز کو حرام پاؤ اسے حرام سمجھو (ابوداؤد)۔'' اسی لیے کتب احادیث اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ان میں حضور ﷺ سے ماثور و منقول تفسیری اقوال موجود ہیں۔ جیسے حضرت عدی بن حبانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ'' سے مراد یہودی اور ''الضَّآلِّيۡنَ'' سے مراد عیسائی (نصاریٰ) ہیں (ترمذی)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اَلصَّلٰوةُ الۡوُسۡطٰى'' سے مراد عصر کی نماز ہے (ترمذی)۔ حضرت ابن مسعودؓ ہی سے روایت ہے کہ جب آیت ﴿اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ﴾ نازل ہوئی تو مسلمانوں پر نہایت شاق گزری۔ صحابہؓ نے عرض کیا: حضور! ہم میں سے کون ہے جس نے ظلم (زیادتی وغیرہ) نہیں کیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب وہ نہیں جو کہ تم نے سمجھا ہے' کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی: ﴿اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ﴿۱۳﴾﴾ (لقمان) ''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔ (اس آیت میں) یہاں ظلم سے مراد شرک ہے (صحیح بخاری)۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ حج اکبر کا دن کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ (ترمذی)۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضور اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آیت قرآنی ﴿وَاَلۡزَمَهُمۡ كَلِمَةَ التَّقۡوٰى﴾ میں 'كَلِمَةَ التَّقۡوٰى' سے مراد کلمۂ طیبہ ہے (ترمذی)۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'کوثر' سے مراد جنّت میں ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے۔ (صحیح مسلم)

چور کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاقۡطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا﴾ (ان کے ہاتھ کاٹ دو)' نبی کریم ﷺ نے مطلق ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے ساتھ مقید فرما دیا۔ فرمانِ خداوندی ہے: ﴿وَلَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵) ''اور ان (جنّتیوں)

کے لیے وہاں پاک بیویاں ہوں گی''۔ حضور ﷺ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ جنّت میں جو بیویاں ملیں گی وہ حیض' تھوک اور ناک کی غلاظت سے پاک ہوں گی۔ اسی طرح قرآن مجید میں نماز' زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا اجمالی حکم دیا گیا' ان کے تفصیلی احکامات کا ذکر نہیں۔ یہ تفصیلی احکامات اور مسائل نبی کریم ﷺ نے ہمارے لیے واضح فرمائے ہیں' جیسے ارشادِ نبوی ہے: ((خُذُوۡا عَنِّيۡ مَنَاسِكَكُمۡ)) ''مجھ سے احکام (حج) سیکھ لو''۔ اور ((صَلُّوۡا كَمَا رَاَيۡتُمُوۡنِيۡ اُصَلِّيۡ)) (صحیح البخاری) ''نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو!'' قرآن کی تشریح کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایسے احکام بھی بیان کیے جو کہ قرآن پاک کے احکام سے بڑھ کر اور ان کی مزید توضیح پر مبنی تھے۔ مثلاً پھوپھی' بھتیجی اور خالہ' بھانجی سے بیک وقت نکاح کرنا منع فرمایا' شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا' وراثت میں دادی کا حصّہ مقرر فرمایا۔ نیز دو گواہوں کی بجائے ایک گواہ اور حلف کی بنا پر مدّعی کے حق میں فیصلہ صادر کیا' وغیرہ۔

(ج) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیری مرویات وتشریحی اقوال

امام سیوطی نے ''الاتقان'' میں درج ذیل مشہور دس مفسّر صحابہؓ کے نام گنوائے ہیں: حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت اُبی بن کعب' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔ اس کے علاوہ درج ذیل صحابہؓ سے بھی تفسیری روایات منقول ہیں: حضرت انس بن مالک' حضرت ابوہریرہ' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم۔ ان کی تفسیری روایات کم ہیں اور ان کو زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ مندرجہ بالا دس مفسّرین صحابہ' تفسیری روایات کی قلت وکثرت کے اعتبار سے ایک درجے پر نہ تھے۔ جیسے حضرات ابوبکر' عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے بہت کم تفسیری اقوال منقول ہیں۔ ایک بڑی وجہ ان کی ملکی اور سیاسی مصروفیات تھیں۔ دوسری اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس دور میں ایسے صحابہ کی کمی نہ تھی جن کا اوڑھنا بچھونا ہی قرآن پاک تھا۔ وہ کتابِ الٰہی کے اسرار وغوامض اور احکام ومعانی کے رازداں تھے۔ اس کے ساتھ خالص عرب ہونے کی بنا پر عربی زبان کی نحو ولغت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس لیے ان کی موجودگی میں خلفائے راشدین کی جانب رجوع کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے سب سے زیادہ تفسیری اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ وہ

خلافت عثمانی کے اختتام تک امورِ حکومت سے زیادہ تر الگ اور عملی مشاغل میں مصروف رہے' نیز ان کا تعلیمی حلقہ بھی قائم رہا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن مسعود اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم سے بھی کثرت سے تفسیری اقوال مروی ہیں۔ اُس دور میں عجمی اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور تفسیر قرآن کی زیادہ محتاج تھیں۔ یہ چاروں اصحاب رسول درج ذیل خصوصیات کے حامل تھے: (ا) صحبتِ نبوی اور رفاقتِ نبویؐ کی بنا پر آیات کی تشریح اور اسبابِ نزول سے مکمل آگاہی (ب) خصوصی قوتِ اجتہاد و استنباط (ج) عربی زبان میں مہارت اور اس کے اسالیب سے گہری مناسبت۔ تاہم حضرت ابن عباسؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے زیادہ مستفید نہ ہو سکے' البتہ کبارِ صحابہ کی رفاقت سے انہوں نے بہت حد تک اس کی تلافی کر لی تھی۔ اس فہرست کے باقی تین صحابہ حضرت زید بن ثابت' ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اگرچہ تفسیر قرآنی میں مشہور تھے مگر ان سے منقول بہت کم تفسیری اقوال ہم تک پہنچے ہیں۔ کثرتِ روایات کی بنا پر پہلے پانچ صحابہ کے نامِ گرامی یوں ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن عبدمناف قریشی ہاشمی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں۔ ان کی والدہ لبابۃ الکبریٰ بنت حارث بن حزن الہلالیہ تھیں۔ یہ اُن دنوں پیدا ہوئے جب بنوہاشم شعب ابی طالب میں محصور تھے۔ پیدا ہونے پر آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا' آپ نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا۔ یہ ہجرتِ مدینہ سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عباس آغازِ طفولیت سے ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی ازواجِ مطہرات میں شامل تھیں' اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر بھی آنا جانا رہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر تیرہ یا پندرہ برس تھی۔ اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے کبار صحابہ کی صحبت اختیار کی اور اپنی علمی تشنگی دور کی۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں آپ امتیازی حیثیت کے مالک رہے۔ راجح قول کے مطابق ۶۸ھ میں آپؓ نے بعمر ستّر سال طائف میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔ محمد بن حنفیہ نے حضرت ابن عباسؓ کو قبر میں اتارا اور ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا: مات واللہ الیوم حبر ھذہ الامۃ ''بخدا آج اس اُمّت کے عظیم عالم نے وفات پائی۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا علمی مقام

آپ کو کثرتِ علم و فضل کی بنا پر حِبر (عظیم عالم)' بحر (سمندر) اور امام المفسّرین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بے نظیر مفسّر قرآن' فقیہہ اور مجتہد تھے۔ حضرت عمرؓ اپنی مجلس میں آپ کو کبار صحابہ کے ساتھ بٹھاتے اور اپنے قریب جگہ دیتے۔ حضرت ابن عباسؓ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے: آپ ہمارے سب نوجوانوں سے حسین تر' بااخلاق اور ان سب سے زیادہ کتابِ الٰہی کے سمجھنے والے ہیں۔ اسی طرح فرماتے کہ ابن عباسؓ عمر کے ادھورے (کم) اور عقل کے پورے ہیں' یہ ذہن رسا اور نکتہ بیان زبان کے مالک ہیں۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے پاس کوئی مشکل مسئلہ آتا تو ابن عباسؓ سے کہتے کہ ایک مشکل مسئلہ درپیش ہے جسے آپ ہی حل کر سکتے ہیں۔ پھر جو حل حضرت ابن عباسؓ پیش کرتے' آپؓ اسے تسلیم کرتے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ ابن عباس ترجمان القرآن ہیں۔ عطاء کا کہنا ہے: میں نے ابن عباس کی مجلس سے بڑھ کر کوئی باعزت محفل نہیں دیکھی' مفسّر آپ کے ہاں ہوتے تھے' فقہاء و شعراء کا ہجوم آپ کے درِ دولت پر رہتا تھا اور یہ سب آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ طاؤس سے کہا گیا کہ اکابر صحابہ کو چھوڑ کر آپ اس نوجوان (حضرت ابن عباسؓ) کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مَیں نے ستّر صحابہ کو دیکھا کہ جب وہ کسی مسئلے پر بات چیت کرتے تو بالآخر ابن عباسؓ کا قول اختیار کرتے۔ قاسم بن محمد کا قول ہے کہ ہم نے عبداللہ بن عباسؓ کی مجلس میں کبھی کوئی باطل تذکرہ نہیں سنا اور ان سے زیادہ کسی کا فتویٰ سُنّتِ نبویؐ کے مشابہ نہیں دیکھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کا اوڑھنا بچھونا پڑھنا پڑھانا اور علمی حقائق و نکات پر روشنی ڈالنا تھا۔ ان کے بارے میں سب سے بہتر بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ ابنُ عَبَّاسٍ اَعْلَمُ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم ''جو کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا' ابن عباس پوری اُمّت میں اس کے سب سے بڑے عالم تھے''۔ ان کے علمی مقام اور شہرت کی سب سے بڑی وجہ ان کے حق میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ہے: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ)) ''اے اللہ! اس کو دین کا فہم عطا فرما اور اسے (قرآن کی) تفسیر و تاویل سکھا دے۔'' دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں

حضور ﷺ کی دعا یوں ہے: ((اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ)) ''اے اللہ! اسے کتاب و حکمت (کا علم) سکھا دے۔''

اس ضمن میں خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ مجھے اکثر احادیث نبویہؐ انصار سے ملیں۔ میری حالت یہ تھی کہ مَیں استفادہ کے لیے کسی ہستی کے پاس جاتا اور انہیں محوِ خواب پاتا۔ اگر مَیں چاہتا تو انہیں بیدار کر سکتا تھا مگر مَیں یوں نہ کرتا' اس لیے مَیں ان کے دروازے پر بیٹھا رہتا' حتیٰ کہ میرا چہرہ گرد و غبار سے اَٹ جاتا۔ جب وہ خود ہی جاگتے تو مجھے جو کچھ دریافت کرنا ہوتا وہ پوچھتا اور واپس لوٹ آتا۔ حضرت ابن عباسؓ مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے اور بوقت ضرورت اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر اس آیت کی تفسیر دریافت کی: ﴿اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا﴾ (الانبیاء: ۳۰) ''کیا اہلِ کفر نے دیکھا نہیں کہ آسمان و زمین بند تھے' پھر ہم نے ان کو پھاڑ (کھول) دیا''۔ آپؓ نے فرمایا کہ ابن عباس کے پاس جاؤ اور وہ جو تفسیر بیان کریں مجھے بتاتے جاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ آسمان خشک تھے' ان سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین بانجھ تھی' اس سے کچھ اُگتا نہیں تھا' بارش کے طفیل یہ پودے اُگانے لگی۔ گویا آسمان کا پھٹنا (فَتق) بارش کے ساتھ ہے اور زمین کا پھل بوٹے اگانے سے۔ اس شخص نے جا کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو یہ تفسیر بتائی تو انہوں نے سن کر فرمایا کہ میں کہا کرتا تھا کہ ابن عباس کی تفسیر قرآن میں جرأت مجھے پسند نہیں' اب مجھے پتہ چلا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے (قرآن کا) خصوصی علم ودیعت ہوا ہے۔

تفسیرِ قرآن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مرتبہ

حضرت ابن عباسؓ کو تفسیرِ قرآن میں جو مرتبہ اعلیٰ حاصل ہے' اس کا اندازہ ان کے شاگرد رشید مجاہدؒ کے قول سے ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو اس سے نور کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمانا ہے کہ ابن عباسؓ گویا باریک پردہ کی اوٹ سے بچشم خود غیبی حقائق کو دیکھتے ہیں۔ کئی صحابہ' تابعین اور معاصرین' تفسیر اور مشکلاتِ قرآن کے حل کے لیے آپ کی جانب رجوع کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ صحابہ سے کسی آیت کا مفہوم دریافت فرماتے اور جب پوری تشفی نہ ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب رجوع کرتے۔

امام طبری روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا: ﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ﴾ تو کسی سے بھی تسلی بخش جواب نہ بن پایا۔ حضرت ابن عباسؓ آپ کے پیچھے بیٹھے تھے' بولے کہ امیر المومنین! دل میں ایک بات آتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ مت جھجکیں' برملا بیان کریں' تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک مثال بیان کی ہے' فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ عمر بھر نیکی کے کام کرتا رہے اور جب اُس کا آخری وقت آئے کہ نیکیوں کی اُسے اس وقت زیادہ ضرورت ہے' تو برائی کا کام کر کے اپنی سب نیکیوں کو برباد کر دے؟

اسی طرح ایک دوسری مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرکاء سے سورۃ النصر کی تفسیر دریافت کی۔ کئی ایک نے سکوت اختیار کیا۔ بعض نے صرف ظاہری اور لفظی مراد بیان کرنے پر اکتفاء کیا کہ حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو فتح و نصرت کی بشارت دی ہے' نیز اس پر حمد و استغفار کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنے جواب میں بتایا کہ یہ سورت اللہ کی فتح و نصرت اور عربوں کے دخولِ اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر ہے۔ اس پر حضرت ابن عباس کی علمی بصیرت اور تفسیری مہارت کی طرف سب کو متوجہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہی امر (تفسیر قرآن) باعث ہے اس نوعمر کی برتری کا۔

صحابۂ کرامؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تفسیری اقوال کو وقعت اور اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عصر تابعین میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی۔ اسی بنا پر مکّہ مکرمہ میں ایک مکتب قائم ہوا' جہاں طلبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے علم تفسیر اخذ کرتے اور پھر مختلف بلاد و امصار میں جا کر اس علم کو پھیلاتے۔ تمام تاریخی ادوار میں حضرت ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال کی اہمیت کا یہ مقام رہا ہے کہ عموماً ان کے مقابلے میں کسی دوسرے قول کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ امام زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ تفسیر میں جب صحابہؓ کے اقوال متعارض ہوں تو حضرت ابن عباسؓ کے قول کو ترجیح دی جائے گی۔ عربی لغت میں بھی حضرت ابن عباسؓ کو کمال حاصل تھا۔ قرآن کریم میں وارد الفاظ غریبہ (نادر الفاظ) کو سمجھنے کے لیے وہ قدیم عربی شاعری کی طرف بھی رجوع کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے سورۃ النحل کی اس آیت کے معنی دریافت کیے ﴿اَوْ یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ﴾ اس پر قبیلہ بنو ہُذَیل کا ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ ہماری زبان (بولی) میں تخوف' کمی

اورنقصان کو کہتے ہیں۔حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا عربی اشعار میں یہ لفظ اس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے؟ اُس نے کہا کہ جی ہاں! اورفوراً ایک شعر سنا دیا۔حضرت عمرؓ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ اپنے دیوان کو تھامے رکھو، تم سے غلطی سرزد نہ ہوگی۔عرض کیا گیا کہ دیوان سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ جاہلی شاعری! اس میں قرآن کی تفسیر اور تمہاری زبان کے معانی موجود ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس ضمن میں خصوصی شہرت کے حامل تھے۔بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپؓ سے قرآن مجید میں استعمال ہونے والے کسی لفظ کے معنی پوچھے جاتے اور آپ جواب میں شعر پڑھ کر سنا دیتے (جس سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا)۔آپ سے بکثرت اشعار منقول ہیں۔ مشہور خارجی سردار نافع بن ارزق نے ایک مرتبہ آپ سے دوصد سوالات کیے اور آپ نے اشعار میں ان کا جواب دیا۔امام جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں اپنی سند سے نافعؒ اور حضرت ابن عباسؓ کے باہمی سوال وجواب کا ذکر کیا ہے۔وہ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحنِ کعبہ میں تشریف فرما تھے اور سوال کرنے والوں کا جمگھٹا تھا۔لوگ آپ سے تفسیر قرآن کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔(اس موقع پر) نافع بن ارزق نے نجدہ بن عویمر سے کہا کہ چلو اس شخص کے پاس چلیں جو علم کے بغیر تفسیر قرآن کی جرأت کرتا ہے۔چنانچہ دونوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم آپ سے تفسیر کے حوالے سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں، ان کی وضاحت کیجیے اور کلام عرب سے استشہاد فرمائیے، کیونکہ اللہ نے قرآن کو بلیغ عربی میں نازل کیا ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ جو دل چاہتا ہے، پوچھیے۔نافع نے کہا کہ (سورۃ المعارج کی) اس آیت کے معنی بتائیے: ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿٣٧﴾﴾ (دائیں اور بائیں حلقے باندھے ہوں گے)۔حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ 'العِزُون' کے معنی ہیں ساتھیوں کے حلقے۔انہوں نے کہا کہ کیا عرب اس معنی سے واقف ہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا: جی ہاں! کیا آپ نے عبید بن الابرص کا یہ شعر نہیں سنا ؎

فجاءوا يهرعون اليه حتى يكونوا حول منبره عزينا

(وہ اس کی طرف بھاگتے ہوئے آتے ہیں اور اس کے منبر کے گرد حلقہ باندھ لیتے ہیں۔)

پھر نافع نے کہا کہ (سورۃ المائدہ کی) اس آیت کے معنی بتلائیے: ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ الوسیلة حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں۔نافع نے کہا کہ کیا عرب اس معنی سے واقف ہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ آپ نے عنترہ کا یہ شعر نہیں سنا:

ان الرجال لهم اليک وسيلة ان ياخذوک تكحّلی وتخضّبی

اس شعر میں وسیلہ کا لفظ حاجت اور ضرورت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ان جوابات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما لغت عرب اور غریب الفاظ میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور اس میدان میں کوئی دوسرا شخص ان کا حریف نہیں تھا۔ایسی ہی خصوصیات کی بنا پر آپ امام التفسیر کہلائے۔بعد میں اس حوالے سے کچھ نزاع بھی پیدا ہوا، لیکن بات صرف اتنی سی ہے کہ اشعار جاہلی تفسیر قرآن کی اصل نہیں بلکہ قرآن پاک میں جو غریب اور نادر الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کی توضیح شعر کے حوالے سے کر دی جاتی ہے اور اس میں جمہور کے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔سورۃ الشعراء میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ ''(یہ قرآن) صاف (اور) واضح عربی زبان میں ہے''۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بے شمار تفسیری روایات منقول ہیں اور ان کے طرق واسانید بھی متعدد اور مختلف ہیں۔لیکن آپؓ سے اخذ ونقل کی بہترین سند از معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباسؓ ہے۔اس سند کے بارے میں امام احمدؒ کا قول ہے کہ مصر میں تفسیر پر مشتمل بروایت علی بن ابی طلحہ ایک رسالہ ہے، اگر اس کی طلب وتلاش میں ایک شخص مصر کا سفر طے کرے تو یہ کچھ زیادہ نہیں۔اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ لیث کے کاتب ابوصالح کے پاس موجود تھا۔ابوصالح نے اس کو بروایت معاویہ بن صالح از علی بن ابی طلحہ از ابن عباسؓ روایت کیا۔یہ نسخہ بخاری میں بھی بروایت ابی صالح منقول ہے۔امام بخاری نے (صحیح بخاری میں) ابن عباسؓ کی تعلیقات کے سلسلہ میں اسی سند پر اعتماد کیا ہے۔امام ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، امام مسلم اور اصحابِ سنن، یہ تمام محدثین علی بن ابی طلحہ کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں۔

کچھ مستشرقین نے اس ضمن میں یہ اعتراض کیا کہ علی بن ابی طلحہ نے یہ تفسیری اقوال براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نہیں سنے۔حافظ ابن حجر نے اس کی یوں تردید کی ہے کہ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ علی بن ابی طلحہ ثقہ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس نے ابن عباسؓ سے براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ سنا ہے۔محدث ذہبی 'المیزان' میں تحریر کرتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباسؓ سے نہایت مفید تفسیری اقوال نقل کیے ہیں۔محدثین کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ نے مجاہد کے واسطے سے ابن عباسؓ سے یہ اقوال نقل کیے ہیں۔اگرچہ علی بن

ابی طلحہ' مجاہد کا نام ذکر نہیں کرتے تاہم اس میں کچھ مضائقہ نہیں' اس لیے کہ مجاہد ثقہ ہیں۔ مختصراً یہ کہ حضرت عباسؓ کے تفسیری اقوال کے سلسلہ میں یہ صحیح ترین سند ہے۔ اس کی صحت وثقاہت کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ امام بخاری جیسے محدث نے اس سند پر اعتماد کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی تفسیری روایات میں سے ضعیف ترین سند محمد بن سائب کلبی از ابوصالح از ابن عباس ہے۔ کلبی کے بارے میں محدثین کے چند اقوال یوں ہیں: کلبی کی روایت تمام محدثین کے نزدیک متروک ہے' وہ ثقہ نہیں' اس کی روایت لکھنے کے قابل نہیں ہوتی' وہ حدیثیں وضع کیا کرتا ہے' وغیرہ۔ کلبی سے روایت کرنے والوں میں محمد بن مروان سُدّی الصغیر کا نام بہت مشہور ہے۔ محدثین کرام اس کو واضعین حدیث میں شمار کرتے اور متروک الحدیث قرار دیتے ہیں۔ امام سیوطی 'الاتقان' میں فرماتے ہیں کہ اگر کلبی کی سند کے ساتھ سُدّی الصغیر کو بھی شمار کر لیا جائے تو یہ سند 'سلسلة الكذب' (سراپا جھوٹ کی لڑی) تصوّر کی جائے گی۔ آپ مزید تحریر کرتے ہیں کہ کلبی متہم الکذب ہے' جب وہ بیمار پڑا تو اپنے اصحاب وتلامذہ سے کہا: ''میں نے جو کچھ بھی بروایت ابوصالح بیان کیا ہے' وہ جھوٹ ہے''۔ محمد بن مروان کے علاوہ ثعلبی اور واحدی بھی کلبی سے روایت کرتے ہیں اور یہ روایات بھی ناقابل اعتماد ہیں۔

ایک ضخیم تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب منسوب ہے جو متعدد مرتبہ 'تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس' کے نام سے مصر میں چھپ چکی ہے' اس کے جامع محمد بن یعقوب فیروز آبادی مصنّف 'القاموس المحیط' ہیں۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے جو اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں' ان کا انحصار محمد بن مروان سُدّی الصغیر کی روایت از محمد بن سائب کلبی از ابوصالح از ابن عباسؓ پر ہے اور اس سند کا مقام ومرتبہ واضح ہو چکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس تفسیر کی بے وقعتی اس اعتبار سے نہیں کہ یہ کچھ بھی علمی مقام نہیں رکھتی' بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ اس کو حضرت ابن عباسؓ سے منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر کثرتِ وضع کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ آپؓ خاندانِ نبوت سے وابستہ تھے' اب ظاہر ہے کہ تفسیری اقوال کو آپؓ کی جانب منسوب کرنے سے ان کی قوت وثقاہت میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ دوسری یہ کہ آپؓ کی نسل سے خلفائے عباسیہ کا ظہور ہوا۔ بعض لوگ ان کے جدِّ امجد حضرت ابن عباسؓ سے روایت کر کے ان کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ (جاری ہے)

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

July 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.7

Monthly Meesaq Lahore